جلد ۱۷۵ ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۰۵ء عدد ۲

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

وفیات

ای میل : email : shibli academy @ rediffmail. com

☆☆☆

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے — فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

شذرات

نومبر کے اواخر میں علامہ شبلیؒ پر جو سمینار کیا گیا تھا، اس کے انعقاد کا فیصلہ دارالمصنفین کی مالی حالت بہتر نہ ہونے کی بنا پر اس کے کارکنوں نے بہت ڈرتے ہوئے کیا تھا اور خواہش کے باوجود متعدد لوگوں کو مدعو نہیں کیا جاسکا تھا، خیال تھا کہ علامہ اور دارالمصنفین کے قدرداں دارالمصنفین کو گراں بار نہیں ہونے دیں گے، اسی بنا پر ہم نے ملک اور بیرون ملک کے اپنے بہت سے کرم فرماؤں کو خطوط لکھے اور ٹیلی فون سے بھی ان سے رابطہ کیا اور گو ہماری توقع کے مطابق ان کا تعاون نہیں ملا لیکن ہماری آواز صدا بہ صحرا بھی نہیں رہی، بہرحال جن کرم فرماؤں نے ہمارا تھوڑا بہت تعاون کیا ان کے ہم صمیم قلب سے شکر گزار ہیں، ان سب حضرات کا نام اس لیے نہیں لیا جاتا کہ وہ خود اس کو پسند نہیں کریں گے، ہم اپنے فاضل دوست مولانا تقی الدین ندوی کے ممنون ہیں کہ ان کی مساعی جمیلہ سے سیرۃ النبیؐ کی جلدوں کا نہایت دیدہ زیب اڈیشن نکلا اور ڈاکٹر افتخار احمد پرنسپل شبلی کالج اور ڈاکٹر نیاز احمد داؤدی کی کوششوں سے اس کے سیکڑوں نسخے نکل گئے، ڈاکٹر افتخار احمد نے مہمانوں کی ضیافت کا بار اٹھا کر عطیات کی کمی کی تلافی کردی اور دارالمصنفین کو زیر بار نہیں ہونے دیا، ایران کلچرل ہاؤس کے ڈائرکٹر آقائی جلال تملہ اور ترقی اردو بیورو کے ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے جزوی تعاون کے لیے بھی ہم شکر گزار ہیں

ہم اپنے ضلع کے ہندی اخباروں اور ملک بھر کے اردو پریس کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے سمینار کی خبریں اور بعض بعض نے اس کی روداد بھی اپنے اخباروں اور رسالوں میں شایع کیں، ہم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ترجمان کانفرنس گزٹ کے نگراں پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی کے خاص طور پر بہت ممنون ہیں جن کا پشتینی تعلق دارالمصنفین سے ہے، ان کے جد امجد مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اس کے بانیوں میں تھے اور اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر بھی رہے اور پدر بزرگوار نواب مولوی عبید الرحمن خاں شروانی اور وہ خود اس کے اہم ارکان میں ہیں، انہوں نے کانفرنس گزٹ کے جنوری کا ایک حصہ سمینار کے لیے مختص کردیا ہے، اس پر

معتدل اور متوازن اداریہ لکھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی، ہمارے رفیق کار حافظ عمیر الصدیق کی مفصل رپورٹ کا بڑا حصہ شایع کیا اور کرم بالائے کرم یہ کہ علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد ۱۹۱۴ء میں راول پنڈی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی رپورٹ بھی اس شمارے میں شامل کردی ہے جس میں وہ رزولیشن درج ہے جس کو ان کے جد امجد نے علامہ کی وفات پر پیش کیا تھا اور جس کی تائید صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے فرمائی تھی اور مولانا محمد علی اڈیٹر کامریڈ نے اس پر اظہار خیال کیا تھا، میر نثار حسین صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ شہر علی گڑھ کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ بھی ہے اور علامہ کی یادگار میں قیام دارالمصنفین کی تجویز پر مولانا ابوالکلام آزاد کی بلیغ تقریر اور مولانا شروانی اور مولانا محمد علی کی تائید کا ذکر بھی ہے۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے علامہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا کہ "علامہ مرحوم کی وفات سے حقیقت میں علم کی کمی واقع ہوئی" اس کی معنویت اس وقت پوری طرح عیاں ہوگئی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی بھی بڑھی ہوئی ہے جس کی تلافی کی کوششیں کسی حد تک ہو رہی ہیں لیکن علم کی کمی حد انتہا کو پہنچ گئی ہے گو مدارس اور جدید تعلیم گاہیں بنتی جارہی ہیں اور ان کے یتطاولون فی البنیان کا منظر بھی ہمارے سامنے ہے لیکن ان کا معیار تعلیم روز بہ روز فروتر اور علم الحتا ہی جارہا ہے، انہوں نے اپنے رزولیشن میں بالکل بجا ارشاد فرمایا "علامہ مرحوم کو جس چیز نے علامہ شبلی بنایا وہ یک رخی تعلیم نہ تھی بلکہ وہ تعلیم مجموعہ تھی، قدیم اور جدید تعلیم کا، پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے جو بات مولانا شبلی میں پیدا ہوئی وہ مرحوم کی تصنیفات سے ظاہر ہے اور علامہ شبلی کی صحبت سے پروفیسر آرنلڈ پر یہ اثر پڑا کہ انہوں نے پریچنگ آف اسلام جیسی کتاب تصنیف کی، میں پھر عرض کروں گا جب تک قدیم اور جدید تعلیم یک جا جمع نہ ہوں، ہماری قوم میں مولانا شبلیؒ جیسے علما پیدا نہیں ہوسکتے"، ہم پچھلے کئی شماروں سے علامہ شبلیؒ کی عظمت و معنویت کو آشکارا کرنے کے لیے جو کچھ لکھتے رہے ہیں، یہ ماقل و مادل تحریر ان سب پر بھاری اور علما و دانش وروں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

ہر قوم و جماعت کے اندر ننگ دیں، ننگ ملت اور ننگ وطن ہمیشہ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو کھلم کھلا دشمنوں سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور چوں کہ تعمیر کے مقابلے میں تخریب

آسان ہوتی ہے، اس لیے یہ چاہے تعداد میں کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں مگر ان کی ضرر رسانی بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن جب کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو اس میں اس طرح کے لوگوں کی تعداد بھی زیادہ ہوجاتی ہے جو اپنے معمولی فایدے کے لیے قوم و ملت کا سستا سودا کرنے لگتے ہیں اور اس میں نفرت و نفاق اور اختلاف و شقاق کا ایسا بیج بو دیتے ہیں جس کے بعد اس کے ابھرنے اور پنپنے کے سارے امکانات معدوم ہوجاتے ہیں، یہ حریص و طماع دشمنوں کا آلہ کار اور ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور جس کام کو دشمن نہیں کرپاتا ہے اسے یہ آناً فاناً میں کردیتے ہیں، مسلمانوں کی تاریخ کے شروع دور ہی سے یہ مار آستیں ان کو ڈستے اور مسلم فرماں رواؤں کی صلح و صفائی میں ہمیشہ روڑا بن کر اصل دشمنوں کو فایدہ پہنچاتے رہے ہیں، برطانوی سازشوں میں آکر دولت عثمانیہ کا خاتمہ اور ترکی میں خلافت کا نام و نشان مٹادینے والوں ہی کے لیے اقبال نے کہا ہے، ع بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ

ذرا بھی نگاہ تعمق سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی عالم اسلام بے گانوں سے نہیں اپنوں ہی کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے، ان ہی کی اوچھی حرکتوں نے سامراجی قوتوں کو اس کا موقع دیا ہے کہ افغانستان اور عراق کو تہس نہس کرنے کے بعد وہ ایران اور شام کو بھی پامال کر ڈالنے کے درپے ہیں، یہ عالم اسلام ہی نہیں حدود حرم میں بھی دندناتے پھر رہے ہیں، یہودی قبلہ اول کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں تو تثلیث کے فرزند میراث خلیل کو اچک لینا چاہتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنے دشمنوں کی مطلب برآری میں لگا ہوا ہے اور حیلہ و بہانہ ڈھونڈ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کررہا ہے، کیا یہ وقت اختلافات ختم کرنے کا ہے یا ان کو بڑھانے کا، ایک پلیٹ فارم پر آنے کا ہے یا سیکڑوں پلیٹ فارم بنانے کا، شیعہ، سنی اور دیوبندی، بریلوی جھگڑے مٹانے کا ہے یا ان کو ہوا دینے کا، تقلید و عدم تقلید کی بحثوں کو سلجھانے کا ہے یا ان میں الجھاؤ پیدا کرنے کا، ایک متحدہ محاذ کی تشکیل کا وقت ہے یا مسلم پرسنل لا بورڈ کی سہ گانہ تقسیم کا، للہ اپنے اوپر اور اپنی ملت پر رحم کیجیے اور امت مرحومہ کا شیرازہ تار تار نہ کیجیے! روح محمدؐ فریاد کررہی ہے۔

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر   اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے

☆☆☆

مقالات

بنگال میں مسلمانوں کی بیداری بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں

از:- ڈاکٹر سید عبدالباری ☆

ہندوستان میں تاریخ اسلام کا ایک روشن باب سرزمینِ بنگال پر لکھا گیا جس کے چپے چپے پر آج سے ۸-۹ سو سال قبل اسلام کی شمعیں روشن کی گئیں تھیں اور بحمدللہ وہ آج تک پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہیں لیکن ہندوستان کی تاریخ میں کئی آزمایش و ابتلا کے ایسے ادوار بھی آئے جب یہ شمعیں جھلملانے لگیں لیکن پھر ایسے عالی مرتبت انسان منظر عام پر آئے جنہوں نے اپنے خون جگر سے ان چراغوں کو روشن رکھا، مسلمانوں نے تیرہویں صدی میں بنگال میں اپنی حکومت قایم کی لیکن بزرگان دین اور صوفیا نے اسے اپنی تبلیغ و اشاعت اسلام کا محور اس سے قبل بنالیا تھا، پھر بنگال کے دور دراز کے علاقوں میں ان بزرگوں کی خانقاہیں خدمت خلق کا مرکز بن گئیں اور انسانی احترام اور مساوات کی تازہ ہوائیں بنگال کے عوام کے درمیان چلنے لگیں، سلہٹ میں شاہ جلال، پنڈوہ میں شاہ اسماعیل غازی و قطب عالم پنڈوی، باگھاہاٹ میں خان جہاں علما نے بڑی بڑی آبادیوں کا دل اپنی بلندیِ اخلاق سے جیت لیا، حضرت خان جہاں نے سندربن کے وسیع جنگلوں اور دلدلوں کے اپنے ساٹھ ہزار خلفا و خادموں کی مدد سے صاف کیا، وسیع پیمانے پر کاشت کاری کرائی اور متمدن معاشرہ کی بنیاد رکھی، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے مرید شاہ جلال گجراتی ڈھاکہ تشریف لے گئے اور وسیع پیمانے پر تبلیغ اسلام کی، تانترک، سادھوؤں اور جادوگروں کے جال سے لوگ آزاد ہوئے، ذلت و خواری کی زندگی کے بندھن ٹوٹ گئے، ایک خدا

☆ ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر، یوپی۔

کی عظمت کے ترانے بلند ہوئے، شاہ جلال تبریزی اور شیخ نور کا ذکر بھی ضروری ہے، بنگال میں حسین شاہی مسلمان بادشاہ صوفیا سے بہت قرب رکھتے تھے، سولہویں صدی میں بنگال میں چیتنہ کی ویشنو تحریک شروع ہوئی، بہ ظاہر یہ ہندو مذہب کو اسلام سے قریب لانے کی کوشش تھی لیکن اس کا اصل مقصد ہندو مذہب کا احیا تھا، اس کے اثر سے پس ماندہ طبقات میں اسلام کی تبلیغ رک گئی، کچھ مسلمان چیتنہ کے اثر سے اسلام کی خالص تعلیمات سے دور ہو رہے تھے، درویشوں کے متعدد گروہ وجود میں آ گئے تھے جن کے عقاید و مشاغل میں بہت سی غیر اسلامی باتیں شامل تھیں، مثلاً فرقہ باولی، ستیہ پیر کے حلقے وغیرہ، کرشن بھگتی کا اثر مسلمانوں میں کچھ لوگوں پر ہوا تھا، ان کی اصلاح میں بنگال میں زبردست تحریکیں وجود میں آئیں، اٹھارہویں - انیسویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد سے سید احمد شہید کے زمانے تک بنگال میں بھی اسلامی بیداری کی لہریں اٹھتی ہوئی نظر آتی ہیں، اردو بولنے والا حلقہ جو کلکتہ اور دیگر بڑے شہروں میں آباد تھا، اس بیداری میں شریک نہیں تھا بلکہ بنگالی بولنے والے صرف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان کی عام اسلامی بیداری میں شریک تھی، سولہویں صدی کے سید سلطان کا جناب شیخ محمد اکرام نے موج کوثر میں ذکر کیا ہے، جنہوں نے بنگلہ زبان میں نظمیں اور کتابیں لکھیں اور اسلام کی تبلیغ کی، ایک کتاب اکبر کے دور میں "وفات رسولؐ" کے عنوان سے لکھی گئی، بنگلہ زبان کی یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی، بہرام سقہ ہردوانی متوفی ۱۵۶۳ء سولہویں صدی کے ایک مقبول عوام پیر تھے، انہوں نے بھی بنگلہ میں کتابیں لکھیں، مولانا حمید دانش مند منگلکوٹی نے سترہویں صدی میں اور شاہ نعمت اللہ قادری و سیدنا شیخ ذاکر علی نے اس عہد میں غیر معمولی دعوتی و تبلیغی خدمات انجام دیں، انیسویں صدی میں بنگال میں خاصی ہماہمی تھی، فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ نے جو بنگال کے غیر معمولی مصلح تھے، اس عظیم صوبے کی کایا پلٹ کر دی، مسلمانوں کو اپنے گرد و پیش کے ماحول کے غیر اسلامی اثرات، مشرکانہ عقاید اور لغو رسوم سے چھٹکارا دلایا، شریعت اللہ کسی بھی زندہ یا مردہ شخص کی اندھی عقیدت کے قائل نہ تھے، قبروں کی پرستش اور چڑھاوے کے خلاف تھے، سادگی اور کسر نفسی کا مرقع تھے، ان کے بیٹے حاجی محمد محسن عرف دودھو میاں نے اصلاحی و تبلیغی مشن کو جوان کے والد نے شروع کیا تھا آگے بڑھایا، بنگال میں جگہ جگہ اپنے نایب مقرر کیے، آپس کے

تنازعات کو ثالثی کے ذریعہ طے کرانے کا انتظام کیا، برطانوی عدالتوں سے کنارہ کش رہنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کے لیے عملاً متوازی نظام حکومت قایم کر دیا، زراعت پیشہ مسلمانوں کے عزت و وقار کی بحالی اور ان کے انسانی حقوق کے لیے جد و جہد کرتے رہے، بڑے بڑے ہندو زمین دار اور نیل کے انگریز کارخانہ دار اس تحریک کے مخالف تھے لیکن دودھو میاں نے حتی الامکان اس طبقہ کے تصادم سے گریز کیا، تیتو میر نے بھی اس عہد میں اپنی انقلابی کوششیں شروع کیں اور بنگال میں اہم اصلاحی کردار ادا کیا۔

حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بھی بنگال نے اہم کردار ادا کیا، یہ تحریک غیر ملکی اقتدار کے ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لیے شروع کی گئی، حضرت سید احمد حج کو روانہ ہوتے وقت کئی ماہ بنگال میں مقیم رہے اور کلکتہ ان کا مرکز اصلاح و تبلیغ تھا، ہزار ہا نفوس ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، ۱۸۲۱ء میں بنگال میں حضرت سید احمد کی مقبولیت کے بارے میں شیخ اکرام ان کے ایک سوانح نگار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "شہر کلکتہ میں بیعت کرنے والوں کی یہ کثرت تھی کہ ہزار پانسو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے سات آٹھ پگڑیوں کو اس مجمع میں پھیلا کر ہر ایک بیعت کنندہ کو حکم دیتے کہ ایک کنارہ کسی پگڑی کا من جملہ ان پگڑیوں کے پکڑ لیوے، پھر کلمات بیعت بہ آواز بلند تلقین کرتے تھے اور یہ کیفیت دن بھر رہتی تھی"۔[1]

بعد میں جب سید صاحب بالاکوٹ جہاد کے لیے تشریف لے گئے تو بنگال نے رسد اور افراد کے ذریعے ان کا بیش از بیش تعاون کیا، سید صاحب نے شہادت سے قبل اپنے معتمدین کو حیدرآباد، بھوپال اور کلکتہ تبلیغ و اصلاح کا کام جاری رکھنے کے لیے بالاکوٹ سے روانہ کیا، چنانچہ مولانا کرامت علی اور ان کے رفقا بنگال میں سرگرم رہے، مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی ۱۸۵۰ء میں بنگال تشریف لائے، یہاں سے مجاہدین کی بڑی تعداد سرحد کی طرف ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے کوچ کرتی رہی، مولوی عنایت علی کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا، دینی محبت و استقامت، ذاتی ایثار ترک تمول کے وہ پیکر تھے، مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ میں:

---

[1] موج کوثر، ص ۲۲، تاج پرنٹرز، دہلی، ۱۹۸۷ء۔

"آج بنگال میں جو دینی روح نظر آتی ہے وہ مولوی صاحب کی سرگرم کوششوں کا نتیجہ ہے، ان کا مرکز ضلع جسور کا موضع حاکم پور تھا، جگہ جگہ مسجدیں تعمیر ہوئیں، امام مقرر ہوئے جو تعلیم بھی دیتے تھے اور لوگوں کے درمیان اختلافات اور ٹکراؤ کو بھی ختم کراتے تھے"۔

انیسویں صدی میں پورے ملک میں انگریزی اقتدار کے بعد جو تغیرات پیدا ہو رہے تھے اور جو تعلیمی و تہذیبی تحریکیں نمو پذیر تھیں ان کا اثر بنگال پر بھی پڑا، سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور ایجوکیشنل کانفرنس کی روشنی بنگال میں بھی پہنچی، کلکتہ کی اردو بولنے والی آبادی اس سے خاص طور پر متاثر تھی، کلکتہ میں جدید تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے لوگ فکرمند تھے۔

انیسویں صدی کے آخری عشروں میں دو ممتاز شخصیتیں بنگال کے افق پر نمودار ہوئیں، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی اعلا ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ حکمرانوں کی نگاہ میں وقار حاصل کیا بلکہ اپنی خدمات کی وجہ سے اپنی قوم کے اندر بھی معزز و مقبول ہوئیں، یہ شخصیتیں نواب عبداللطیف اور سید امیر علی مرحوم کی تھیں۔

نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسایٹی قایم کی، اس میں میسور و اودھ کے سابق حکمرانوں، گھرانوں کے افراد کے علاوہ سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے ۲۳ ممبران پر انتظامیہ کمیٹی مشتمل تھی، یہ سماجی اور تعلیمی مقاصد کے لیے قایم کی گئی تھی، مسلمانوں کے مختلف مسایل کے حل میں اس نے موثر کردار ادا کیا، اس لیے کہ انگریز صاحب بہادر اس سوسایٹی سے برابر مختلف امور میں مشورے کرتے تھے، اس تنظیم نے اعلا تعلیم کے لیے باصلاحیت نوجوانوں کو وظایف دیے، جسٹس امیر علی کو اس سوسایٹی نے محسن فنڈ سے اعلا تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظیفہ عطا کیا تھا، اس فنڈ کے ٹرسٹی مولوی کرامت علی تھے، یہ تنظیم مسلمانوں کے سربرآوردہ طبقات کے لیے بہت سے امور میں فیض بخش ثابت ہوئی، اگرچہ مسلم کرانیکل اپنی ۳/ مارچ ۱۹۰۰ء کی اشاعت میں اس کے جلسوں کو تماشا قرار دیتا ہے۔

سید امیر علی کی شخصیت اس عہد کے بنگال کی ممتاز ترین شخصیت ہے جو اعلا ذہنی و دماغی صلاحیتوں سے مالا مال تھی، انہوں نے کلکتہ یونی ورسٹی سے ایم اے بی ایل کی ڈگری حاصل کی اور

اسی زمانہ میں مزید تعلیم کے لیے ولایت گئے جب کہ سرسید اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ لندن گئے تھے، واپس آکر پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں محمڈن لا کے پروفیسر ہو گئے، ۱۸۷۶ء میں انہوں نے سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسیشن قایم کی اور ۲۵ سال تک اس کے سکریٹری رہے، ۱۹۰۴ء میں وہ انگلینڈ چلے گئے اور پریوی کونسل کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا، ۱۹۰۹ء میں وفات ہوئی، ان کی زندگی صاف ستھری اور کردار بلند تھا، لیجسلیٹو کونسل کے رکن اور ہائی کورٹ جج ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کو ہر موقع پر اولیت دیتے تھے، ان کی قایم کردہ اسوسیشن مسلم لیگ سے قبل مسلمانوں کی اہم سیاسی جماعت تھی، ان کی مشہور کتابیں اسپرٹ آف اسلام ہے، تاریخ اسلام و محمڈن لا ایران کو بلند مقام عطا کرتی ہیں، بہ قول شیخ اکرام امیر علی یورپ اور مسیحیت کی حقیقت سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے اسلام کا دفاع دیگر اہل علم سے زیادہ کامیابی کے ساتھ کیا ہے، اس سے زیادہ جامع کتاب اس موضوع پر اس عہد تک نہیں لکھی گئی تھی، بہ قول ڈاکٹر اسمتھ ماڈرن اسلام ان انڈیا، اسپرٹ آف اسلام سے زیادہ دور حاضر کی کسی مذہبی کتاب کے حوالے نہیں ملتے۔

سید امیر علی کی قایم کردہ C.N.M.A. کے بنگال میں سات سو ممبران تھے، اس کا اولین مقصد ہندوستانی مسلمانوں کا احیا (Regeneration) تھا اور اس احیا کی راہ ان کی اخلاقی نشأۃ نو کے ذریعہ ہموار کی جاتی تھی، اس کے علاوہ حکومت سے مسلمانوں کے جایز اور معقول مطالبات کو تسلیم کرانے کی جدوجہد اس کا دوسرا اہم مقصد تھا، امیر علی میں غیر معمولی تنظیمی صلاحیت تھی، ان کی علمی رفعت کی وجہ سے C.N.M.A. کو بیسویں صدی کے آغاز میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، جس کا اعتراف اس عہد کے ممتاز افراد نے کیا ہے، یہ تنظیم اگرچہ عبداللطیف کی تنظیم جیسے مقاصد ہی رکھتی تھی لیکن زیادہ روشن خیال تھی اور بہ قول "اخبار مسلمان" دونوں ایک ہی مکتبہ خیال سے تعلق رکھتی تھیں۔ (مسلمان، اکتوبر ۱۹۰۶ء)

اس تنظیم نے مسلمانوں میں نظم و اتحاد کو اپنا مشن بنایا، گو اس نے کانگریس سے اپنے کو دور رکھا لیکن ہندو بھائیوں سے مفاہمت کی آرزومند رہی، بنگال کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قایم ہوئیں، ۱۹۰۹ء میں صوبہ کی تقریباً چھ دیگر تنظیموں نے اس سے روابط استوار کیے اور حکومت کو میمورنڈم اور عرض داشتیں پیش کرتی رہی جو زیادہ تر امیر علی کے قلم سے لکھی جاتی تھیں، گو

اس کے بھی ممبران زیادہ تر بڑے زمین دار، تجار اور سرکاری عہدے دار تھے لیکن اس نے اپنے دائرے کو خاصی وسعت دی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں بنگال میں مسلم انجمنوں کی بہار آئی ہوئی تھی جو جگہ جگہ قایم ہو رہی تھیں، ان کی کثرت پر طنز کرتے ہوئے مدیر مستقبل کلکتہ قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا:

''اگر انجمن سازی کا یہی حال رہا تو وہ دن آنے والا ہے کہ ہندوستان میں آل انڈیا پنساری کانفرنس اور آل انڈیا افیونی اسوسیشن تک تیار ہو جائے گی، دنیا میں جو شخص بھی چاہے گا ایک آل انڈیا انجمن یا کانفرنس یا اسوسیشن لے کر اپنا ڈھول خود بجانے لگے گا اور جس طرح سرکس اور تھیٹر مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی اپنا بستر باندھے دس بیس ممبروں کو ساتھ لے کر شہروں شہروں کی گشت لگائیں گے اور بازار قومیت میں یہ جنس اتنی ارزاں ہوگی کہ پھر کوئی مفت بھی نہ لے گا''۔

ان سطروں کی تقریب یہ تھی کہ میاں محمد شفیع نے لاہور سے کلکتہ آکر اپنی انجمن قایم کی تھی اور قاضی عبدالغفار اس کے سخت خلاف تھے، مستقبل کے جنوری ۱۹۱۸ء کے شمارہ میں یہ تبصرہ درج ہے:

بیسویں صدی میں بنگال شورشوں اور ہنگاموں کا محور رہا، ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی وجہ سے ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان خلیج میں اضافہ ہوا، سرکاری عہدوں اور ملازمتوں میں مسلمان اپنے ہم وطنوں سے پیچھے تھے اور مشرقی بنگال پر بھی مغربی بنگال کی تعلیم یافتہ برادران وطن چھائے ہوئے تھے لیکن تقسیم بنگال کو بہت سے مسلمانوں نے بھی نامناسب قرار دیا، مولوی دلاور حسین اور مولوی شمس الہدیٰ اس کے مخالف تھے، سی، این، ام، اے نے بھی اس کو ناپسند کیا، ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ نے بھی اس کی مخالفت کی لیکن بعد میں اس موضوع پر دونوں طبقوں میں دوری بڑھنے لگی، اس لیے کہ ہندوؤں کی انتہا پسند تنظیموں نے اسے فرقہ وارانہ قرار دے دیا، نرادسی چودھری کے الفاظ میں ہندوؤں کے سودیشی گروپ نے جگہ جگہ وندے ماترم گانا شروع کر دیا اور شیواجی و کالی کو تقسیم بنگال ختم کرنے کی تحریک کی علامت بنایا، مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ شروع کیا، ہندو زمین داروں نے مسلمان مزدوروں پر ظلم کرنا شروع کر دیا، اس زمانہ میں خاصی تلخی پیدا

ہوئی اور فسادات جگہ جگہ پھوٹ پڑے، ڈھاکہ کے نواب کی سرپرستی میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد بنگال میں رکھی گئی، بنگال کے مسلمانوں کا شمالی ہند کے بھائیوں سے رشتہ اور مضبوط ہونے لگا، مسلمانوں میں احساس محرومی نے شدت اختیار کی، وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ تعلیم میں پیچھے ہیں، غیر منظم ہیں، بھدرلوک ہندو ان سے ہر معاملہ میں آگے ہے، ملازمتوں میں ان کا وجود صفر ہے، ان کا کوئی نمایندہ بنگال کونسل میں منتخب ہو کر نہیں پہنچتا، میونسپل انتخابات میں بھی وہ منتخب ہو کر نہیں پہنچ پاتے، ''مسلم کرانیکل'' نے ۱۸۹۵ء میں مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حکومت کو متوجہ کرنے کے لیے انتخابات کا بائیکاٹ کریں اور جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کریں، بنگالی مسلمانوں کا اعلا تعلیم یافتہ طبقہ اس طرف مائل ہوا کہ عوام میں بیداری اور ان کے مطالبات کو منظم طریقہ سے پیش کرنے کی طرف اقدام کیا جائے، ۴/اکتوبر ۱۹۰۷ء کی ''دی مسلمان'' نے مسلمانوں کی حالت زار کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''مسلمانوں میں تعلیم یافتہ اشراف ملازمتوں کے لیے مضطرب ہیں اور دیہات کا مسلمان پریشان ہے کہ اسے نمک کی فراہمی اور چوکی داری ٹیکس سے نجات ملے اور اپنی زمینوں پر جسے وہ بوتے جوتتے ہیں قبضہ برقرار رکھ سکیں''۔

مہر سدھا کر نے بھی اس عہد کے بنگال کے مسلمانوں کی پریشانی کا ذکر کرتے ہیں:

''اگرچہ مسلمان آبادی کے اعتبار سے بڑی تعداد میں ہیں لیکن ان کا کوئی نمایندہ بنگال کونسل میں کامیاب ہو کر نہیں پہنچتا، ہندوؤں کے اثرات کے آگے وہ ٹھہر نہیں سکتا''۔[1]

ان محرومیوں اور پریشانیوں کے باوجود حیرت ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں بنگال ملت اسلامیہ کا پھڑکتا ہوا دل (Nerve Centre) بنا ہوا تھا، اس سرزمین سے ایسی جلیل القدر شخصیتیں اٹھیں جنہوں نے پورے برصغیر کی قیادت کا پرچم اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا، علم و فکر کا چراغ ان کے ہاتھوں میں تھا، اپنے ماضی قریب کے عالی حوصلہ مسلمان مصلحین کا خون ان کی رگوں میں رواں

---

[1] The Bengal Muslim 1871-1906 Quest for Identity by Rafiuddin, Page 160, 1988 آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، نیویارک۔

تھا، اس وقت یوں تو پورے ملک میں بیداری کی لہریں اٹھ رہی تھیں لیکن بنگال کا مسلمان روشن ضمیری اور جرأت فکر میں کسی سے پیچھے نہ تھا، مغرب کے تہذیبی غلبہ اور عیسائی مشنریوں کی اسلام کو داغ دار کرنے کی کوششوں کا جواب بنگال کے مسلمانوں نے دیا، مسٹر مجیب اشرف کے الفاظ میں:

''بنگال میں مسلمانوں کی مزاحمت وکشاکش نمایاں اور براہ راست تھی، یہاں غدر سے بہت پہلے برطانوی اقتدار ملک کے دیگر حصوں کے بالمقابل زیادہ مستحکم ہو چکا تھا، بنگال کے بالمقابل شمالی ہند میں دیگر مقامات پر مزاحمت اتنی شدید نہ تھی، اس لیے کہ وہاں برطانوی طاقتیں مسلمانوں کی تہذیب ومذہب کی تحقیر کے معاملہ میں محتاط تھیں اور کھل کر دریدہ ذہنی کا ثبوت یہ لوگ نہیں دیتے تھے''۔[1]

بیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں برطانیہ اپنے نظریاتی لبرلزم کے باوجود اعلا درجہ کی عدم مفاہمت تنگ نظری سیاسی دھوکہ دھڑی، معاشرتی تفرقہ اندازی اور مذہبی منافرت پیدا کرنے کی پالیسی پر کار فرما تھا اور بنگال اس کا خاص طور پر محور تھا، جہاں ہندو مسلمان دونوں آبادی کے اعتبار سے تقریباً برابر تھے لیکن تعلیمی واقتصادی اعتبار سے ان کے درمیان غیر معمولی خلیج حائل تھی۔

بیسویں صدی سے قبل پوری انیسویں صدی مسلمانانِ ہند کے مجاہدوں اور درویشوں کی گزرگاہ تھی، غالباً اسی کے اثر سے بیسویں صدی میں مسلمانان بنگال جدید علوم اور مغربی اثرات کے باوجود اپنی جڑوں سے الگ نہیں ہوئے، جو نئی انجمنیں اور ادارے وجود میں آئے، انہوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقے اور علما و مذہبی راہ نماؤں کو جوڑنے کی کوشش کی، باہمی ربط وتعاون کی اسپرٹ پیدا ہوئی، ان انجمنوں کی بہ دولت قصبوں اور دیہاتوں میں مسلمان کسانوں کو راحتیں حاصل ہوئیں جن کی ایک مدت سے بڑے بڑے ہندو زمین داروں سے کشمکش چلی آرہی تھی، دیہات کی انجمنوں نے ملت کے افراد کو ماضی کے مسلمان مصلحین اور مذہبی پیشواؤں کے نقوش قدم پر سفر جاری رکھنے کا ولولہ تازہ عطا کیا، منشی مہر اللہ کے تابناک رول کا مورخین ذکر کرتے ہیں، جنہوں نے انجمن کے قیام واستحکام کی بھرپور جدوجہد کی، ان کے سوانح نگار اسیر الدین لکھتے ہیں کہ:

---

1. Muslim Attitnde towards British Rule & Western Culture in India by Idara-e-Adabiate Alia. Delhi, Page 272.

''مہر الدین بنگال میں اس تحریک کے بانی تھے جو متعدد انجمنوں کی تشکیل کا سبب بنی''۔

معز الدین احمد انجمنوں کے مثبت کردار اور قوم کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوششوں پر روشنی ڈالتے ہیں، ان کے خیال میں اس ساری جدوجہد کا مرکزی نقطہ اسلام کے لیے فدائیت اور اس کا فروغ تھا۔ (امارسنسار جہان، معز الدین احمد)

ابن معز الدین کی انجمن نے مسلم عوام کی زندگی تبدیل کردی اس کو مولوی خلیل الرحمن کی تائید اور مقامی زمین دار ارجمند خان کی مالی اعانت حاصل تھی اور اس کے ذریعہ مدرسے، مکاتب اور معاشی امداد کے ادارے وجود میں آئے، زکوۃ کی اجتماعی طور پر وصول یابی اور اس کی مناسب تقسیم کا نظم قایم ہوا، غریب کسانوں کو مالی امداد بہ طور قرض دینے کا انتظام کیا گیا، ملک کے باہر اسلامی مقاصد کے لیے امداد بھیجی گئی، مثلاً اسی زمانہ میں حجاز میں ریل کی تعمیر ہو رہی تھی اس کے لیے پیسے بھیجے گئے، وعظ کی محفلوں کا برابر انعقاد کیا گیا، ایسے مبلغین مقرر کیے گئے جو عوام کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرتے تھے، چنانچہ اس عہد کے مورخین کے الفاظ میں ان کی مساعی سے مساجد میں نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا، لوگوں کی تہذیبی زندگی اور لباس میں بہتری پیدا ہوئی، ہندو رسوم سے جو مشرکانہ روایات سے لبریز تھیں لوگوں کی دل چسپیاں ختم ہوئیں، ان انجمنوں نے عوام میں اجتماعی شعور پیدا کیا اور سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی راہ دکھائی، انگریزوں سے تصادم وٹکراؤ کے بہ جائے ان کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی طرف میلان پیدا ہوا، جدید تعلیم سے وحشت ختم ہوئی، مولوی کرامت علی نے ہندوستان کے اسی وقت کے حکم رانوں سے جہاد کو غلط قرار دیا، اگرچہ لٹریری سوسائٹی کے عبد اللطیف نے اصلاح پسندوں کو گم کردہ راہ قرار دیا جو راسخ العقیدگی کی راہ ترک کر رہے تھے۔

بیسویں صدی کے عین نقطۂ آغاز کے وقت جب کہ جدیدیت وقدامت کی کشمکش جاری تھی، کلکتہ کے رفقا پر ایک ایسا سورج طلوع ہوا جس نے پورے ملک میں ملت اسلامیہ کی رگوں میں خون کی حرارت بڑھا دی، مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ میں اسلامی احیا کے نفس ناطقہ بن کر سامنے آئے، ان کے ممتاز رسایل ''لسان الصدق'' اور ''الہلال'' و ''البلاغ'' نے سوئی ہوئی قوم کو

بیدار کرنے کی مہم شروع کی ، لسان الصدق ۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء کلکتہ سے شایع ہوا اور ابوسلمان شاہ جہاں پوری کے الفاظ میں یہ ایک علمی وتنقیدی جریدہ کے ساتھ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی دعوت دینے والا رسالہ تھا ، سیاسی تبصرے اور اہم نیشنل وانٹرنیشنل واقعات پر اظہار رائے ملتا تھا ، ہندوستان کی کانگریس پارٹی اور انگلستان کی کنزرویٹو اور لبرل پارٹی پر تبصرے کیے جاتے ، مولانا آزاد نے بھی بنگال کے دیگر اکابرین علم وفکر کی طرح ایک انجمن کی تشکیل کا ارادہ کیا اور رسالہ کے دفتر کو مذاکرہ وتبادلہ خیالات کا مرکز بنانا چاہا ، چنانچہ مولوی احسن مالک احسن الاخبار کے تعاون سے حمیدیہ ہوٹل کے اوپر ایک ہال حاصل کیا گیا اور ''الاصلاح'' کے عنوان سے ایک انجمن اور ''دارالاخبار'' کے نام سے ایک ریڈنگ روم وجود میں آیا ، اس انجمن کے مقاصد تھے کہ کلکتہ کے علمی مذاق کو فروغ دیا جائے ، قوم میں اتحاد پیدا کیا جائے ، تحریر وتقریر کی صلاحیتیں نکھاری جائیں ، اصلاح رسوم کی جائے اور ایک ایسا مرکز علم وتہذیب قایم کیا جائے جو لوگوں کے فکری و اخلاقی معیار کو بلند کرسکے ، مولانا آزاد خود اس کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں :

''اس زمانہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو قایم ہوچکی تھی اور مولوی شبلی اس کے ناظم تھے ، انہوں نے انجمن کے ارکان اس کی انتظامیہ میں سے چن لیا تھا ، دوسری شاخ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاح رسوم کی قایم کی تھی ، یہی دو لسان الصدق کے خاص مقاصد تھے ، چنانچہ سوشل ریفارم کے سلسلہ میں مولانا آزاد کی الاصلاح سرگرم رہی ، سوشل ریفارم کے ضمن میں یہ وضاحت کی گئی کہ مسلمانوں کے موجودہ رسم ورواج کی بنا پر ہندوؤں کے میل جول سے پڑی ، ان میں عربی سادگی اور ایرانی تکلف کی جگہ ایک خاص مخلوط ہندوستانی رنگ نظر آنے لگا ، وہ اپنے قدیمی سرچشمہ سے دور ہوگئے ، مذہبی توہمات اور علما کی غفلت نے عوام کو موقع دے دیا کہ وہ رسم ورواج کو داخل مذہب سمجھ کر ہر مسلمان کے لیے اسے لازمی سمجھ لیں ، علما وواعظین کو اس سے مالی منفعت ہوتی تھی ، اس لیے اعلان حق سے باز رہتے تھے'' ۔[1]

۱ بحوالہ مولانا آزاد کی صحافت ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری ، ادارۂ تصنیف وتحقیق کراچی ، ص ۳۷ ، ۱۹۸۹ء ۔

مولانا اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ انگریزوں کے دور میں تعلیم کی طرف رجحان بڑھا ، پھر بھی رسم سے مسلمان دست کش نہ ہوسکے ، یہ رسوم سینکڑوں خاندانوں کی بربادی کا سبب ہوئیں ، معمولی معمولی تقریبوں پر ہزاروں روپے صرف ہونے لگے اور سوسایٹی کے ڈر سے کوئی ان کی مخالفت نہ کرسکا ، مولانا نے اس بیماری کی جڑ لکھنؤ کے زوال آمادہ تمدن کو قرار دیا جس کا اثر انیسویں صدی کے اواخر میں کلکتہ ، بنگال پر پڑا ، کلکتہ میں اکثر یہ آوازیں سننے میں آتی تھیں ، چمن میاں کی شادی میں ۵ ہزار کا قرضہ ہوگیا اور چھٹن میاں کے ختنے میں دو مکان گروی ہوگئے ، اس طرح خاندان کے خاندان فاقوں کا شکار ہوتا اور سود کے جال میں پھنستا جاتا تھا ، مولانا کو کلکتہ کے اس خطرناک مرض کی فکر تھی جس میں لکھنؤ اور دیگر شہر مبتلا ہوکر خوش حالی کھو بیٹھے ، تعلیم کے عام ہونے سے یہ بیماری نہیں جارہی تھی اور اس کے لیے مہم چلانے کی ضرورت تھی ، مولانا آزاد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلما کی اس سلسلہ میں کوششوں کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں ، کانفرنس نے اصلاح تمدن کا ایک الگ شعبہ قایم کیا تھا جس کے سکریٹری جیسا کہ ذکر آچکا ہے غلام الثقلین تھے ، مولانا آزاد کے اخبار میں اس سلسلہ میں بڑے اہم مضامین شایع ہوئے ، مثلاً اسلام اور رسوم ان محمد یوسف جعفری ، شادی توہمات اور شگون آہ - ابوالنصر آہ دہلوی وغیرہ ۔

۱۹۰۵ء میں مولانا آزاد نے ''لسان الصدق'' میں اصلاح خیال کی طرف توجہ کی ، اس میدان میں سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' کی خدمات کا وہ اعتراف کرتے تھے ، بہ قول خلیق نظامی :

''سرسید کی صحافتی زندگی اور اس کی روایات سے مولانا آزاد نے پورا پورا اثر قبول کیا ، لسان الصدق اور الہلال دونوں میں تہذیب الاخلاق کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے'' ۔[1]

مولانا آزاد کی کرشمہ کار شخصیت اور حیرت انگیز ذہانت نے پورے ملک کو حیرت میں ڈال دیا اور کلکتہ کی دھاک پورے ملک پر بیٹھ گئی ، حالی اسی زمانہ میں جب آزاد سے لاہور میں ملے تو حیرت میں پڑگئے کہ کیا یہی لسان الصدق جیسے اخبار کے مدیر ہیں ، اس وقت مولانا کی عمر ۱۷ رسال تھی ۔

۱ آج کل دہلی ، مولانا آزاد نمبر ، ۱۹۸۸ء ۔

پھر جب ۱۹۱۲ء میں انہوں نے کلکتہ سے "الہلال" کا اجرا کیا تو گویا یہ شہر مسلمانان ہند کی ذہنی وفکری رفعتوں کا مرکز ومحور بن گیا، دعوت اسلامی اسی اخبار کا مرکزی خیال تھا، مولانا اتحاد اسلامی کے پرجوش حامی تھے، انہوں نے کلکتہ ہی نہیں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو بین الاقوامی فکرو نظر عطا کی، الہلال ذہنوں کو بیدار کرتا اور دل ودماغ میں چنگاریاں پیدا کرتا رہا، اگرچہ وہ جدید تعلیم کے معاملہ میں سرسید کی حکمت عملی کے مخالف تھے اور بہ قول اشتیاق حسین قریشی انہوں نے اسلام کو سائنسی دریافتوں کے سیاق میں سمجھنے سے انکار کردیا، مولانا کے یہاں کبھی کبھی معقولیت پسندانہ اور استدلالی انداز جو سرسید کا خاصہ تھا نہیں ملتا اور وہ خطیبانہ بلاغت طرازی سے زیادہ کام لیتے ہیں، انہوں نے مسلمانوں میں غیر معمولی خود اعتمادی پیدا کی لیکن وہ اب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد سے متفق نہ رہے اور دھیرے دھیرے انڈین نیشنل کانگریس کی طرف ان کا میلان بڑھنے لگا۔

الہلال کے دور میں مولانا نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بہ قول سجاد انصاری اس طرح جگایا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہوجائیں، وہ ابھی عمر کے ۳۰ سال پورے نہ کرپائے تھے کہ پورے ملک میں الہلال کی وجہ سے ان کا طوطی بول رہا تھا، بہ قول مولانا ماجد دریابادی:

"اس نے اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی، صورت، سیرت، مغزو قالب سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف، ہر جلسہ کی زینت ان کی ذات سے ہونے لگی، الہلال بہ ظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی، اس کی سیاست پر بین الملی سیاست کی چھاپ لگی ہوتی تھی، اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے دبتے اور جھجکتے تھے"۔[1]

اس عہد کے علما ومشائخ مولانا آزاد کی توصیف کررہے تھے، شیخ الہند جیسے عالی مرتبت انسان نے فرمایا کہ ہم جو سبق بھولے ہوئے تھے اسے ابوالکلام نے ہمیں یاد دلایا، مولانا سلیمان ندوی

[1] صدق جدید لکھنؤ، ۱۹۵۸ء۔

نے فرمایا کہ:

"نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال والبلاغ نے پیدا کیا، انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن کی ہر آیت کو اس طرح پیش کیا کہ اس نے ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے"۔

مولانا اس وقت اپنی ملت سے اس طرح مخاطب تھے گویا ان کا ہر قطرۂ خون ان کے نوک قلم پر رقصاں تھا، ملاحظہ ہو:

"چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفحات پر بچھانا چاہتا ہوں کیوں کر بچھاؤں، چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں کیوں کر پھیلاؤں، آہ ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں جو دلوں میں ناسور پیدا کردیں"۔

"موت دونوں کو آتی ہے، سپاہی کو میدان جنگ میں اور مجرم کو سولی کے تختہ پر، پہلی وہ عزت کی موت ہے جس پر ذلت کی ہزاروں زندگیاں قربان اور دوسری وہ ذلت کی موت ہے جس کے بعد انسانی روح کے لیے اور کوئی ذلت نہیں، اگر یورپ نے ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو کاش ہمارے سینہ میں گولی لگتی ہمارے گلے میں پھندا ڈالا جاتا"۔

"زندگی عیش ونشاط نہیں، ڈوب ڈوب کر ابھرنے اور قدم قدم پر ٹھوکریں لگنے، چلنے اور گر پڑنے لیکن پھر سنبھلنے اور سب کو سنبھال لینے کا نام ہے"۔

"اب آہستہ خرامی کا وقت نہیں، ساتھ چلنے والوں کی گرد پا کا سراغ نہیں ملتا اور آپ کی نصیحت ہے کہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلیں"۔

الہلال والبلاغ نے وہ ولولہ عطا کیا کہ بنگال سے گویا بجلیاں کوندیں گی اور ظلم وجہل کے نشیمن کو خاکستر بنادیں گی، خلافت تحریک تک آتے آتے بنگال ملت اسلامیہ کی شہ رگ بن گیا، مسلمانوں کے کتنے اداروں کی کلکتہ وبنگال کے غیرت مند تجار نے کفالت کی، پان اسلامزم کا غلغلہ بلند ہوا، خود جمال الدین افغانی اسی عہد میں کلکتہ تشریف لائے، مولانا آزاد کو کلکتہ چھوڑ کر

رانچی جانا پڑا، حزب اللہ کی تحریک میں وہ رنگ بھرنے کی کوشش کرتے رہے، ایک منزل وہ آئی کہ پوری ملت اسلامیہ ہند نے ان کو امام الہند تسلیم کرنے پر غور کرنا شروع کیا، مگر بیسویں صدی کے ربع ثانی تک آتے آتے مولانا کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے مشن سے تھک گئے، خلافت تحریک کا چراغ گل ہونے کے بعد وہ خود کو رہبر بے کارواں محسوس کرنے لگے، ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں بنگال خلافت کانفرنس کے وقت انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس سے ان کی ذہنی تنہائی اور وطن میں رہتے ہوئے غریب الوطنی کے احساس کا اظہار کیا گیا ہے:

''میری طرف دیکھو میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہا سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کرتا رہا، صرف ایک ہی بات کی طرف تڑپ تڑپ کر پکارتا رہا تھا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا تھا، تم نے ہمیشہ اعراض کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں، افسوس کہ تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو''۔

دھیرے دھیرے مولانا کا تعلق کلکتہ سے واجبی سا رہ گیا، مسلم لیگ کو جب اس خطہ میں عروج حاصل ہوا اور اس کے رہنماؤں کی ایک بڑی جماعت منظر عام پر آئی تو مولانا کی بات پر کان دھرنے والے اور کم ہوگئے۔

کلکتہ اور اس عہد کے بنگال میں مسلمانوں کی سرگرمیوں اور ان کی قیادت پر اسی عہد کے ایک اخبار ''مستقبل'' میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے، کلکتہ سے یہ اخبار ۱۹۱۸ء میں اردو کے ممتاز اہل قلم اور منجھے ہوئے صحافی قاضی عبدالغفار کی ادارت سے شایع ہونا شروع ہوا، اس وقت جنگ عظیم اپنے آخری مراحل میں تھی اور ۴-۵ سال مسلسل جاری رہنے والی اس خوف ناک جنگ سے پوری دنیا اور خاص طور پر مسلمان متاثر تھے، ان پر مایوسی کی کیفیت طاری تھی، اخباروں پر برطانوی حکومت نے سنسرشپ عاید کر رکھی تھی، قاضی عبدالغفار نے اسے ملک میں انارکسٹ پیدا ہونے کا ایک سبب قرار دیا، وہ لکھتے ہیں:

''پریس ایکٹ پبلک کی آواز کو روکتا ہے، پبلک کی آواز بند کرنے کی وجہ سے اندرونی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، بنگال میں لارڈ کرزن کی

گورنمنٹ سختیاں نہ کرتی تو کبھی انارکسٹ نہ پیدا ہوتے''۔

اس اردو صحافی نے کلکتہ میں حکومت کے جبر و تشدد کی لہروں کے خلاف آواز بلند کی:

''ہمیں حکومت کو بتا دینا چاہیے کہ بازوئے عمل ابھی نہیں تھکے اور وادی پرخار میں قدم چلنے سے بیکار نہیں ہوئے''۔

ھلنا کے ایک انگریز ڈسٹرکٹ جج نے اسی زمانہ میں ایک جلسہ تقسیم انعامات میں یہ گل افشانی کی ''ہندوستانیوں میں ایک ایمان دار آدمی کا ملنا بھی مشکل ہے''، قاضی صاحب نے اسے جواب دیا:

''اگر یہ سچ ہے تو پھر اس قدر بے ایمان آدمیوں کے ملک میں صاحب بہادر کو نہ رہنا چاہیے، ملک کے گناہ گار ہندوؤں کی اصلاح کا کام بہت مشکل ہے، مناسب ہے کہ للہ اپنے اوقات عزیز کو اپنے وطن کی خدمت میں صرف کریں اور فرانس چلے جائیں، ہم بے ایمانوں کی جیب سے ان کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کا لینے والا کوئی اور آجائے گا''۔ (جمہور، ص ۱۸)

اخبار ''مستقبل'' بنگال بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات کا سچا ترجمان بنتا ہے جب وہ عالم گیر اسلامی وحدت کی حمایت کرتا ہے، قاضی صاحب پان اسلامزم کی تائید میں برابر مضامین لکھتے ہیں اور افغانی کے اوصاف پر روشنی ڈالتے ہیں، چوں کہ اسلام وحدت بنی آدم کا بھی علم بردار ہے، اس لیے مستقبل کے مدیر برادران وطن کے اشتراک عمل کا پیغام دیتے ہیں۔

کلکتہ کی مسلم آبادی کا مزاج سیکڑوں سال سے آفاقیت کے رنگ (Cosmopdilan) کا حامل رہا ہے، قاضی عبدالغفار اس کی نشان دہی بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں:

''کلکتہ میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ہیں، رسم و رواج، معاشرت، خیالات اور عقاید کے لحاظ سے ہر ایک اپنا جداگانہ وجود رکھتے ہیں، کولوٹولہ کے مسلمان جو دلی والے کہے جاتے ہیں ایک خاص قسم کی معاشرت اور ایک مخصوص طرز زندگی رکھتے ہیں، یمن بوہرے کولوٹولہ والوں کی طرح تجارت پیشہ ہیں مگر ان کی تجارت مختلف ہے اور بہ لحاظ معاشرت و خیالات دوسرے مسلمانوں سے جدا ہیں، اسی طرح کچھ بہاری مسلمان ہیں جو بہ لحاظ یک جہتی کوئی خاص وجود

نہیں رکھتے تاہم اپنی امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں، کلکتہ کی ایرانی جماعت بھی اپنا ایک جداگانہ وجود رکھتی ہے، یہ سب کو اصطلاح عوام میں باہر والے ہندوستان والے ہیں جنہوں نے کلکتہ کو اپنا وطن بنالیا ہے اور اپنے کاروبار کے ذریعہ کلکتہ کے مختلف حصوں میں ایک اسلامی شان پیدا کردی ہے، ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد بنگالی مسلمانوں کی ہے"۔ (۸ر جنوری ۱۹۱۸ء)

اخبار کے مدیر کو شکایت ہے کہ ان سب کے باوجود کلکتہ کے مسلمانوں کو وسعت نظری اور دماغی نشو ونما کی ضرورت ہے، وہ ہنوز دور تک نہیں دیکھ سکتے، ان کی رائے ہے کہ انہیں نظر کو وسیع خیال کو بلند اور دل کو صاف رکھنے کی ضرورت ہے، قاضی عبدالغفار خاص بنگال کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان کے باہر کے مسلمانوں سے تعلقات بہت کم ہیں، بنگالی ہندوؤں کی طرح ان کا ہندوستان صرف بنگال اور ان کی دنیا صرف بنگال ہے، یہی اجنبیت بنگال کے مسلمانوں کی پستی کا سبب ہے، یہ قدامت پسندی اور توہم پرستی میں مبتلا ہیں، ان کی اصلاح کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، غربت کے سبب وہ آگے بڑھنے سے معذور ہیں، البتہ کلکتہ کے گردونواح میں مسلمان مزدوروں اور کاری گروں کی جو جماعت ہے وہ اسلامی غیرت سے لبریز ہے، (قاضی عبدالغفار مولوی امام الدین کا ذکر کرتے ہیں) جنہوں نے اس زمانہ میں بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح کی زبردست کوشش کی"۔ (۱۷ر جنوری ۱۹۱۸ء)

قاضی صاحب اسی دور میں کلکتہ میں آل انڈیا کامن لینگویج کانفرنس کا ذکر کرتے ہیں جس میں ہندی کو زبان عام بنانے کے فیصلے کا ذکر ہے مگر اس کی کمیٹی میں کسی مسلمان کو شریک نہیں کیا گیا ہے، اس سے مدیر کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ زبان گاندھی کے موقف یعنی ہندوستانی کے برخلاف ہوگی اور سنسکرت آمیز ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

بنگال میں شہر کلکتہ اگرچہ اس وقت پرجوش مخیر اور مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں سے خالی نہ تھا لیکن مدیر مستقبل شکوہ سنج ہیں کہ "جہاں اتنے دولت مند اور تجارت پیشہ

مسلمان ہوں وہاں ایک قوم پرست نظر حیات ملی کی نشانی ڈھونڈھتی ہے، حالاں کہ وہ ایک نہیں کئی مقامات پر اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ملک کی مختلف ملی تنظیموں کی کلکتہ کے مسلمان کھل کر مدد کرتے ہیں"، اسی زمانہ میں کلکتہ سے انجمن مظلومین بہار کے لیے صرف ڈھائی ماہ میں ایک لاکھ روپے جمع کیا گیا، مدیر مستقبل آرزومند ہیں کہ کاش کولوٹولہ ایک طاقت اور عمل کا مرکز بن جائے اور قومی طاقت کا شیرازہ پراگندہ نہ رہے، اس وقت سبھی کو یہ احساس تھا کہ بنگالی مسلمان بہ لحاظ تعلیم وترقی پس ماندہ ہیں اور اپنے خول سے نکل کر باہر کی دنیا پر نگاہ ڈالنا نہیں چاہتے۔

بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ میں کلکتہ میں انجمن اعانت نظر بندان اسلام قایم ہوئی اور انگریزی استبداد کا شکار ہونے والے مظلوموں کی پوری مدد کی گئی، اسی اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انجمن معین الاسلام بھی کلکتہ میں سرگرم عمل تھی اور ۱۲ر اگست ۱۹۱۸ء کو منعقد ہونے والے ایک جلسہ کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں جو اسی انجمن کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا اور اس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے شریک ہونے کا ذکر ہے، اس جلسہ کا سبب یہ تھا کہ اس وقت بنگال کے مشہور لیڈر رپن چند نے اتحاد اسلامی (پان اسلامزم) پر سخت تنقید کی تھی اور مسلمانوں کی وفاداری کو مشتبہ قرار دیا تھا، اس کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی مسلمانوں کی کچھ مقدس شخصیتوں اور اسلامی عقاید کے خلاف کچھ لکھا تھا، مسلمانوں کے جذبات مشتعل تھے، چنانچہ معین الاسلام نے تمام اطراف ہند کے علمائے امت کو مدعو کیا تھا، ایک انگریز مدیر انڈین نیوز نے حضور کے مرقد مبارک کے بارے میں نازیبا بات لکھی تھی، اس کے خلاف بھی بنگال میں زبردست احتجاج ہوا۔

اخبار مستقبل کے مدیر اگرچہ سیاسی اعتبار سے کانگریس کے حامی تھے مگر ان کے اخبار کے صفحات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی وقت سے کلکتہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا محور بن گیا تھا اور اس پارٹی کے زیر انتظام بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے جس میں سید وزیر حسن اور راجہ محمود آباد شریک ہوئے، اسی طرح ایک بڑے جلسہ میں ۱۹۱۸ء میں ایک اسلامیہ کالج کے قیام کی تجویز منظور ہونے کا ذکر ہے پھر یہ بھی تفصیل ملتی ہے کہ سیاسی راہ نما اس طرح کے ٹھوس کاموں میں دل چسپی نہیں لیتے ہیں اور صرف تجویز کی حد تک جوش وخروش رہتا ہے۔

غرض بیسویں صدی کا ربع اول بنگال کے مسلمانوں کی تاریخ میں اس اعتبار سے

بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ اس عہد میں کلکتہ نے ملت اسلامیہ کو چند نادر و نرالی شخصیات عطا کیں، کانگریس و مسلم لیگ و تحریک خلافت کا یہ محور و مرکز بنا رہا، مسلمانوں کے کسی ممتاز راہ نما کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ کلکتہ کو نظر انداز کرسکے، اس عہد میں مسلم معاشرہ میں بنگالی قومیت، زبان اور تہذیب اور مسلمانوں کی بین الملی شناخت میں کوئی تصادم نہیں شروع ہوا تھا، بنگال کے مسلمانوں کی قیادت بڑی حد تک کلکتہ کی اردو بولنے والی آبادی کررہی تھی، خلافت تحریک اور پان اسلامزم کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا رشتہ ملک اور دنیائے اسلام کے مسلمانوں سے بہت گہرا تھا، قاضی نذرالاسلام بھی اسلام کی عظمت، ملی وحدت اور اسلامی شناخت کے معاملہ میں علامہ اقبال کے ہم نوا نظر آتے ہیں، غرض یہ عہد بنگال کی مسلم تاریخ کا ایک تابناک باب محسوس ہوتا ہے۔
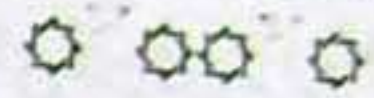
مولانا ابوالکلام آزاد

(مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد)

از - ضیاء الدین اصلاحی

اس کتاب میں پہلے سورۂ فاتحہ کی اہمیت و جامعیت، حمد کا مفہوم اور لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم بیان کیا گیا ہے پھر سورۂ فاتحہ میں بیان کردہ صفات الٰہی، ربوبیت، رحمت اور عدالت کے متعلق مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور تصورات پر مفصل اور دل آویز بحث کی گئی ہے، صفت ربوبیت کی توضیح میں ربوبیت الٰہی کے مظاہر، نظام ربوبیت، نظام پرورش، عناصر حیات کی کارفرمائیوں وغیرہ کے متعلق مولانا کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے، رحمت کے ذیل میں رحمت کا مفہوم، رحمٰن و رحیم کا فرق، نسب و صبر اور توبہ و انابت کی تشریح کی گئی ہے، عدالت کے ذیل میں دین کے معنی، مالک یوم الدین کی حقیقت اور عدالت الٰہی کا اعلان، وضع میزان وغیرہ کی وضاحت و ترجمانی کی گئی ہے، دوسرے حصے میں مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنے والے رسایل و جراید میں نیرنگ عالم، المصباح، احسن الاخبار، خدنگ نظر، لسان الصدق، الندوہ، الہلال، البلاغ، پیغام، اقدام، الجامعہ، ثقافۃ الہند وغیرہ کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں قومی جدوجہد میں مولانا کی خدمات اور ان کے حصے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت: ۱۱۰/روپے

تذکرۂ الٰہی (خزینۂ گنج) کا تحقیقی تجزیہ

از:- ڈاکٹر نورالسعید اختر*

(۲)

ایرانی محقق اور معروف مصنف احمد گلچین معانی کو اس بات پر حیرت ہے کہ میر الٰہی اپنی شہرت اور جہاں گیر و شاہ جہاں جیسے شہنشاہوں کی عالی شان خدمات کے باوجود بھی مورخین اور تذکرہ نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہے، مزید تعجب اس بات پر بھی ہے کہ میر الٰہی کے ہم عصروں نے بھی ان کے کارناموں کے بارے میں سرسری اشارے تک نہیں کیے، احمد گلچین معانی کا بیان ملاحظہ کیجیے:

''این نکتہ نیز قابل ذکر است کہ باوجود شہرتی کہ میر الٰہی در زمان خود داشتہ و طول مدت اقامت او در ہند ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تا ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲ء و ملازمت جہاں گیر و شاہ جہاں، ہیچ یک از مورخان و تذکرہ نویسان عصری وے احوالش کوچکترین اشارتی بدیں نہ کردہ اند کہ وی تذکرہ تالیف کردہ باشد''۔ (ماخوذ از تاریخ تذکرہ ہای فارسی، از احمد گلچین معانی، ص ۵۱۸)

محققین نے تاریخ واقعیات کشمیر اور چند تذکروں کی مدد سے میر الٰہی کی زندگی کے سرسری حالات قلم بند کردیے لیکن ان کے داخلی حالات کا کہیں حوالہ نہیں دیا، الٰہی کے تذکرے اور دیوان میں بھی ان کی زندگی کو اجاگر کرنے والے اشارے بہت کم ہیں، لہٰذا اس کی نجی زندگی پر قلم اٹھانا مشکل ہے، راقم نے دیوان الٰہی اور تذکرۂ الٰہی کے عمیق مطالعہ کے بعد داخلی شہادتوں کے پیش نظر الٰہی

* ایل آئی، ایف/۱۰۷، اندھیری ایسٹ، ممبئی-۹۳۔

کے حیات اور افکار کے تانے بانے کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ میر الٰہی کے تذکرے کے بارے میں کہیں بھی مختصر سا اشارہ نظر نہیں آتا، ڈاکٹر اشپرنگر اس کے لیے میر الٰہی کے نامکمل تذکرے کو اس بے توجہی اور لاعلمی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اشپرنگر کا خیال ہے کہ اگر یہ تذکرہ مکمل ہوتا تو علما و فضلا کی نظروں سے اوجھل نہ رہتا، راقم نے اس بے توجہی اور چشم پوشی کی توجیہ میر الٰہی کے پایۂ تخت سے دوری قرار دی ہے۔

تذکرے کا نام: میر الٰہی کا تذکرہ دو ناموں سے موسوم ہے، الٰہی نے اسے ''تذکرۂ الٰہی'' اور ''خزینۂ گنج'' کے ناموں سے بہ ذات خود یاد کیا ہے، چنانچہ میر الٰہی لکھتے ہیں:

۱- ''این تذکرہ کہ 'خزینۂ گنج' الٰہیست''۔ (ص ۱۴، در ذکر آذری)

۲- ''مولف تذکرۂ الٰہی عماد الدین محمود الٰہی الحسینی''۔ (ص ۱۴، در ذکر آذری)

۳- مولف کتاب الٰہی الحسینی''۔ (ص ۳۶، در ذکر مولانا آہی)

۴- ''مولف این تذکرۂ الٰہی الحسینی، الٰہی الحسینی الہمدانی''۔ (ص ۸۰، در بیان خواجہ سلمان ساوجی)

۵- ''مولف این تذکرۂ الٰہی، الٰہی الحسینی''۔ (ص ۸۱، در ذکر مولانا سیمی)

۶- ''صاحب این تذکرۂ الٰہی در سال ہزار و دہ ۱۰۱۰ھ''۔ (ص ۶۲، در ذکر شاہ داعی اللہ شیرازی)

۷- ''محرر این تذکرۂ الٰہی''۔ (ص ۴۷، در ذکر پری جمالی)

۸- ''مولف این تذکرہ تالیفی از شیخ جمالی دیدہ''۔ (ص ۴۸، در ذکر پری جمالی)

الٰہی نے اپنے تذکرے کو اس کی صفات کی مناسبت سے ''خزینۂ گنج'' قرار دیا ہے، ایک جگہ ''کتاب الٰہی'' اور زیادہ تر تذکرۂ الٰہی کے نام سے موسوم کیا ہے، دراصل یہ تذکرہ ''تذکرۂ الٰہی'' کے نام سے مشہور ہونا چاہیے تھا، مخطوطے کے ابتدائی صفحے پر بھی یہی نام درج ہے، معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر یہ ''خزینۂ گنج'' کے نام سے شہرت پا گیا۔

سنہ تالیف: راقم کا خیال ہے کہ میر الٰہی نے تذکرے کی تالیف کا ارادہ بہت پہلے سے کرلیا

تھا، اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب وہ شاہ داعی اللہ شیرازی کے یہاں شیراز میں مقیم تھے تو ان کے حجرے میں بیٹھ کر شاہ داعی کے دیوان کا انتخاب محفوظ کر رہے تھے، چنانچہ اس امر کی تصدیق میں رقم طراز ہیں کہ:

''دیوان وی را (شاہ داعی) در ہمان بقعہ انتخاب نمودہ''۔ (ص ۶۲، تذکرۂ الٰہی)

بدقسمتی سے نوعمری میں اکٹھا کیا ہوا مواد کسی وجہ سے ضایع ہوگیا۔

''لیکن منتخبات...... دوران از دست رفت''۔ (ص ۶۳، تذکرۂ الٰہی)

یہ واقعہ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء کا ہے جیسا کہ الٰہی کا بیان ہے:

''صاحب این تذکرۂ الٰہی در سال ہزار و دہ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء بطلب علم و کمال بشیراز رفتہ بود''۔ (ص ۶۳، تذکرۂ الٰہی)

(مولف سخن سرایان ہمدان نے الٰہی کے ہندوستان پہنچنے کا سال ۱۰۰۹ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے)۔

میر الٰہی ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء سے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء تک یعنی ۴۴ سال تک ہندوستان میں رہے اور آخر دم تک تذکرے کی تالیف میں مصروف رہے، بہ قول ڈاکٹر عبدالحق دو حصوں میں تذکرہ مکمل کیا، ڈاکٹر عبدالحق دہلی، یونی ورسٹی دہلی کی تحقیق کے پیش نظر اور ان کے مخزونہ نسخۂ تذکرۂ الٰہی ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء میں مکمل ہوا جو دو حصوں میں ہے، افسوس ہے اب ان کی تحویل میں نہ اصل نسخہ ہے اور نہ ہی اس کا زیراکس۔

تذکرے میں شعرا اور دیگر اشخاص کے ناموں کی تعداد: اس ضمن میں ڈاکٹر اشپرنگر نے اودھ کیٹلاگ کے صفحات نمبر ۱۶۲ تا ۱۸۲ میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ اس تذکرے میں کل ۴۰۰ شعرا کے نام شامل ہیں، ڈاکٹر اشپرنگر کے تتبع میں دوسرے محققین نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا، راقم نے تذکرے کے مخطوطے کا دقیق مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ اس میں ۵۳۳ شعرا اور دیگر افراد کا ذکر ہے، جس میں صوفیہ، اکابر، بادشاہوں، حاکموں، صوبہ داروں اور چند شاعرات بھی شامل ہیں، تذکرے میں ناموں کی فہرست بہ لحاظ ابجد ہے، ملاحظہ کیجیے:

(۱)	صفحہ	صفحہ		صفحہ	صفحہ		صفحہ	صفحہ
	الف	ب		الف	ب		الف	ب
الف	۱	۳۷	د	۶۲	۶۵	غ	۱۱۸	۱۲۰
ب/پ	۳۷	۳۹	ذ	۶۶	۶۶.	ف	۱۲۰	۱۲۸
ت	۴۰		ر	۶۶	۷۰	ق	۱۲۹	۱۳۶
ث	۴۰		ز	۷۰	۷۲	ک	۱۳۶	۱۳۹
ج	۴۰	۴۷	س	۷۲	۸۳	ل	۱۴۰	۱۴۲
(ج)	۴۷		ش	۸۳	۸۹	م	۱۴۲	۱۵۰
ج	۴۷	۴۸	ص	۸۹	۹۲	ن	۱۵۰ تا	۱۶۰
(خ)	۴۹		ض	۹۲	۹۲	و	۱۵۰ تا	۱۶۱
ح	۵۰	۵۷	ط	۹۴	۹۴	ہ	۱۶۱ تا	۱۷۴
خ	۵۷	۶۱	ع	۹۵	۱۱۸	ی	ڈاکٹر عبدالحق کا نسخہ یہاں پر ختم ہوتا ہے۔	

(۲) تذکرے میں کل اوراق ۱۷۴+۲=۱۷۶۔

(۳) صفحات کی تعداد = ۳۵۲۔

(۴) تذکرے میں مقدمہ اور خاتمہ یعنی ترقیمہ نہیں ہے۔

(۵) تذکرے میں تاریخ تصنیف درج نہیں ہے، ڈاکٹر عبدالحق کے یہاں تاریخ کتابت درج ہے۔

(۶) تذکرہ کئی لحاظ سے نامکمل ہے، ذیل میں تذکرے کی خامیوں پر سرسری نظر ڈالی جارہی ہے

۱- کئی اوراق خالی چھوڑ دیے گئے ہیں۔

۲- کہیں کہیں پر شاعر کا تذکرہ نہیں لیکن اس کے اشعار کا انتخاب موجود ہے۔

۱- (نوٹ): ڈاکٹر عبدالحق پروفیسر شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی کے پاس تذکرۂ الہی کی اصل یا نقل نہیں ہے۔

۲- ڈاکٹر عبدالحق کے بیان کے مطابق اس تذکرے کے دونوں حصوں میں ۶۴۰ شعرا اور افراد کا ذکر ہے۔

۳- کچھ اوراق پر صرف شاعر کا نام لکھا ہوا ہے۔

۴- کچھ نام خلط ملط ہو گئے ہیں۔

۵- نمونے کے اشعار حاشیوں میں رواں خط میں لکھے گئے ہیں جن کا پڑھنا بہت مشکل ہے۔

۶- انوری ابیوردی کا قطع اور خیام کی رباعی تسامح کے باعث غلط جگہ مثالوں کے طور پر دے دی گئی ہیں، اس قسم کی فاش غلطی میر الہی سے ہونا ممکن نہیں، ہو ناقل یا کاتب ہو سکتی ہے۔

تذکرۂ الہی سے متعلق ڈاکٹر عبدالحق کے بیانات

معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء کے شمارے صفحہ نمبر ۳۰۷ تا ۳۱۰ پر ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے کہ متذکرہ تذکرے کا مخطوطہ ان کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے، انہوں نے تذکرۂ الہی سے متعلق مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی ہیں:

۱- یہ نسخہ بڑی حد تک مکمل ہے، معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۰۴۔

۲- اشپرنگر (برلن) کے مخطوطے میں مقدمہ اور ترقیمہ دونوں نہیں ہیں۔

۳- ڈاکٹر صاحب کے مخطوطے میں مقدمہ نہیں ہے لیکن ترقیمہ ہے۔

۴- اول یہ کہ اس کا نام تذکرۂ الہی ہے۔

۵- اشپرنگر کا نسخہ پہلی جلد ہے جو شعرائے متقدمین پر مشتمل ہے۔

۶- مصنف کے پورے نام لقب اور والد کے نام کی صراحت تذکرۂ الہی میں موجود ہے۔

۷- ترقیمہ کے مطابق یہ نسخہ ۱۰۶۵ھ مطابق ۱۶۵۴ء میں مکمل ہوا۔

۸- تذکرۂ الہی خود مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ (برلن والے نسخہ پر میر الہی کی دستخط بھی ہے)

۹- تذکرہ کا مقدمہ دستبرد زمانہ سے ضائع ہو گیا۔

۱۰- ڈاکٹر صاحب کا نسخہ حروف تہجی کے مطابق ہے۔

۱۱- ڈاکٹر صاحب کا نسخہ ہمایوں پر نہیں بلکہ یوسف بن جامی پر ختم ہوتا ہے۔

۱۲- ڈاکٹر صاحب کے نسخے کے چند صفحات غایب ہیں۔

۱۳- ڈاکٹر صاحب کا نسخہ ابوعلی سینا سے شروع ہوتا ہے۔

۱۴- ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں ۶۴۰ (دونوں جلدوں میں) شعرا کا تذکرہ ہے۔

۱۵- ڈاکٹر صاحب کا نسخہ دو جلدوں پر منحصر ہے:

جلد اول - الف تا ع　جلد دوم - ف تا ی

۱۶-دونوں جلدیں ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔

۱۷-کاغذ کی بوسیدگی، تذکرے کی قدامت پر دال ہے۔

۱۸-روشنائی بھی اسی عہد کا پتہ دیتی ہے۔

۱۹-تذکرے کا خط نستعلیق ہے۔

۲۰-نسخہ کافی بوسیدہ ہے اور جگہ جگہ پر کرم خوردہ ہے۔

۲۱-پورا نسخہ ایک قلم، ایک سیاہی اور ایک ہی قسم کے کاغذ پر لکھا گیا ہے۔

۲۲-مخطوطے کی تحریر بہت روشن اور پختہ ہے۔

۲۳-ہر صفحہ ۱۵ سطری ہے۔

۲۴-ہر نئے شاعر یا نام کے لیے پیراگراف کا التزام ہے۔

۲۵-اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ نسخہ زیادہ صحیح اور مکمل ہے۔

۲۶-اس تذکرے کی اشاعت سے فارسی تذکرہ و تاریخ، اسلوب و آہنگ شناسی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ (ص ۳۱۰)

مگر جیسا کہ پہلے گزرا اب ان کے پاس ان کی صراحت کے مطابق نسخہ نہیں رہا۔

تذکرے کے ماخذ ڈاکٹر اشپرنگر، ڈاکٹر سید علی رضا نقوی، احمد گلچین معانی اور ڈاکٹر توحید عالم نے تذکرۂ الٰہی (تذکرۂ خزینۂ گنج) کے جن ماخذوں کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ مزید پانچ ماخذوں کا راقم نے اضافہ کیا ہے، جن سے میر الٰہی نے استفادہ کیا تھا، یہ اضافہ شدہ ماخذ حسب ذیل ہیں:

۱-تذکرۃ النساء، ص ۱۴، بی بی آتون کے ذکر میں۔

۲-تاریخ صوفیہ؟ ص ۲۵، در ذکر امینی سمنانی۔

۳-حبیب السیر ص ۲۵، در ذکر صدر الدین امینی۔

۴-تذکرۂ شیخ جمالی دہلوی، ص ۴۸، الف۔

۵-تاریخ شاہ رخ، ص ۱، (تذکرۂ الٰہی)۔

مندرجہ ذیل دونوں تذکروں سے میر الٰہی نے حتی الامکان استفادہ کیا ہے۔

الف: تذکرہ عرفات العاشقین از تقی اوحدی۔

ب: مذکر احباب از خواجہ امیر الدین حسن نثاری۔

دوسرے ماخذ کے نام یہ ہیں:

۱-تذکرہ دولت شاہ سمرقندی از دولت شاہ۔

۲-مجالس النفائس، میر علی شیر نوائی۔

۳-مقالۃ الابرار (تذکرۂ مشائخ)۔

۴-مجالس عبد القادر از عبد القادر مراغائی۔

۵-جواہر العجایب از فخری۔

۶-تحفۂ سامی از سام مرزا۔

تذکرہ میں جن شعرا یا اشخاص کے صرف نام درج ہیں ان کی فہرست ملاحظہ ہو:

۱- اہلی چغتائی	۱۲- عبدی بیگ نویدی
۲- مولانا ثانی	۱۳- خواجہ عبدالملک عصامی
۳- شیخ جمالی کا صرف انتخاب اشعار	۱۴- میرزا قاسم جنابدی
۴- ذکر خواجہ شمس الدین حافظ	۱۵- قاضی مراغہ ابی سمنانی
۵- رضائی ہزار جریبی	۱۶- خواجہ لہراسب
۶- امیر رضائی	۱۷- بابا نصیبی گیلانی
۷- سلطان حسین والی لاہیجان	۱۸- مولانا نظام الدین استر آبادی
۸- سلطان سلیم بن سلطان بایزید	۱۹- سید نور الدین نعمت اللہ
۹- امیر سید شریف	۲۰- باقی قزوینی
۱۰- علامہ جرجانی	۲۱- سید ہادی نقش بندی
۱۱- مولانا سیرفی	۲۲- امیر ہمایوں

ڈاکٹر اشپرنگر یا برلن لائبریری کے کتاب دار نے صفحات کی تعداد ۳۳۹ لکھی ہے، ممکن ہے کتاب دار نے خالی صفحات کا شمار نہ کیا ہو، راقم کے مطابق تذکرۂ الٰہی (تذکرۂ خزینۂ گنج) میں

۳۵۲ صفحات ہیں، خالی صفحات کی تعداد ۲۷ ہے اور نیم خالی صفحے ۴۰ ہیں۔

تذکرے کی کتابت

میر الٰہی نے تذکرے میں شعرائے متوسطین قرن نہم و دہم کا ذکر کیا ہے (بہ قول مصنف یہ پہلی جلد ہے) علاوہ ازیں قرن نہم کے چند ایسے شعرا کا حال بھی اس میں شامل ہے، جن کا تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کے تذکرے میں موجود ہے۔

تذکرۂ الٰہی کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کا نثری حصہ بہ خط مصنف مرقوم ہے اور منظوم حصہ کسی خوش خط کاتب نے میر الٰہی کی نگرانی میں نقل کیا ہے، نثری حصہ میں کئی جگہ قلم کا قط چھوٹا بڑا نظر آتا ہے، منظوم حصہ خط نستعلیق کا اچھا نمونہ ہے، مگر نثری خط کافی صاف ستھرا ہے، حروف کے نوک پلک ایسے نہیں ہیں کہ انہیں خط نستعلق سے موسوم کیا جائے تاہم قاری کو اس کے پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، میر الٰہی نے جہاں کہیں تصحیح کی ہے وہاں پر خط شکستہ استعمال کیا ہے، آخری صفحات میں کاتب کے بدل جانے سے بدلا ہوا خط نظر آتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ حصے کاتب کی بے توجہی اور سہل انکاری کے باعث خالی رہ گئے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ حصے کلام اور حالات کی عدم دست یابی کے باعث خالی رہ گئے ہوں، ورنہ ایک ذمہ دار اور مرفہ الحال شخص جو مدتوں سے ایک اہم کارنامہ انجام دے رہا ہو، دانستہ ایسا کرے جس سے اس کی ۳۵ سالہ محنت پر داغ لگ جائے، ممکن نہیں ہے۔

میر الٰہی بہ حیثیت تذکرہ نگار

ہمارے خیال میں فن تذکرہ نگاری اور تاریخ نویسی میں چولی دامن کا رشتہ ہے، دونوں میں واقعیات اور حقایق کی چھان بین کے بعد مصنف کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے، تذکرہ میں اشخاص کا انفرادی جایزہ مختصر حالات وکوایف کے ساتھ قلم بند کیا جاتا ہے، گویا تذکرہ نگار کو دریا کو کوزے میں بند کرنا ہوتا ہے، اسی دایرے میں انفرادی شخصیات کی جملہ خصوصیات اور افکار کی مکمل ترجمانی کرنی پڑتی ہے تاکہ قاری کو چند اقتباسات اور منتخبہ شعری و نثری اثاثے سے کسی شاعر یا نثر نگار کی تاریخی، ادبی، شعری، شاہانہ، حاکمانہ، صوفیانہ حیثیت کا کماحقہٗ اندازہ ہوسکے، اس کے خاطر تذکرہ نگار کو دیگر ماخذوں کے تنقیدی تجزیہ کے بعد موضوع سے متعلق مواد اور مثالیں فراہم کرنی ہوتی ہیں، اس شیشہ گری میں دور و دراز کا سفر کرکے بیانات کی تصحیح کرنی پڑتی ہے، ہم عصر شعرا سے ذاتی ملاقات ان کے قیافے اور روزمرہ کی زندگی کی عکاسی میں ممد و معاون ثابت ہوتی

ہے، بہرکیف تذکرہ نگاری ایک آگ کا دریا ہے جسے ڈوب کر پار کرنا ہوتا ہے۔

قابل فخر بات یہ ہے کہ تذکرہ نویسی کا آغاز عوفی کے تذکرہ "لباب الالباب" کے ساتھ ہندوستان میں ہوا، میر الٰہی ہمدانی کا "تذکرۂ الٰہی" بھی ہندوستانی تذکروں میں سرفراز ہے، میر الٰہی کا خود نوشت تذکرہ جو تین سو پچاس صفحات پر محیط ہے ہمارے پیش نظر ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ تذکرہ میر الٰہی کی برسہابرس کی کاوش کا نتیجہ ہے، میر الٰہی کے حق میں بادی النظر میں کوئی حتمی فیصلہ صادر کردینا اتنا آسان نہیں ہے، فارسی تذکرہ نگاری کے میدان میں دولت شاہ سمرقندی، میر علی شیر نوائی، سام میرزا اور تقی اوحدی کا نام صف اول میں ہے، میر الٰہی نے اپنے تذکرے کا زیادہ تر مواد ان ہی مستند تذکروں سے اخذ کیا ہے اور ان کے اسلوب کی پیروی بھی کی ہے، گویا انہوں نے بڑی جد و جہد اور باریک بینی کے بعد حقایق و واقعیات کو مثالوں کے ساتھ جمع کیا اور اپنے تذکرے میں جگہ دی، متعدد شعرا کے دواوین کا غایر مطالعہ کیا اور اشعار کے انتخاب میں اپنی لیاقت و فراست کا ثبوت دیا، الٰہی نے البتہ اہلی شیرازی، عماد فقیہ اور مولانا جامی کے دو سو سے زاید اشعار مثال کے طور پر درج کیے، ممکن ہے الٰہی کو ان شعرا سے زیادہ انسیت ہو، حالاں کہ تذکرہ نگار کے یہاں اعتدال پسندی لازمی ہے، اس کے انحراف سے تذکرے کے توازن میں کوتاہی ہوسکتی ہے۔

زیر نظر تذکرہ میر الٰہی کے تذکرے کا دفتر اول ہے جیسا کہ میر الٰہی کے تذکرے کے ترقیمہ سے ظاہر ہے:

> "تمام شد ایں دفتر اول از تذکرۂ الٰہی کہ در ذکر متقدمین شعرای علیین مکان را روز دوشنبہ ماہ شوال بہ تاریخ ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء، ہزار و شصت و پنج مولف ایں تذکرہ الٰہی، عماد الدین محمود المتخلص بہ الٰہی الحسینی ابن امیر حجۃ اللہ حسینی اسعد آبادی الہمدانی است"۔ (ص ۳۱۰، معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء، مقالہ عبدالحق)

میر الٰہی کو تذکرہ الٰہی کی جلد اول کے پیش نظر صف اول کے تذکرہ نگاروں میں شمار کرنا مشکل ہے تاہم ہمارے اس خیال سے میر الٰہی کے تذکرے کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا، ان کا تذکرہ فارسی ادب کے ادبی ورثہ میں یقیناً ایک لائق تحسین و آفریں اضافہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تذکرۂ الٰہی حصہ اول کے اندراجات کی تفصیل بہ لحاظِ حروف تہجی دے دی جائے:

ص ۱ - ابن یمین	ص ۳ - ابن سیف
ص ۳ - ابن تاج کیل	ص ۳ - ابن فرج
ص ۳ - محمود ابن زنگی	ص ۴ - خواجہ کمال الدین ابن نصوح
ص ۵ - جمال الدین ابن حسام	(دو شعر کے بعد جگہ چھوڑ دی گئی ہے)
ص ۵ - مولانا محمد ابن حسام	ص ۶ - قاضی ابن جلال
ص ۷ - شیخ ابوالفضل	(خواجہ سعید مہنہ / خواجہ ابوالنصر مہنہ)
ص ۷ - ابن قطب	ص ۸ - ابن جلال
ص ۸ - ابن اسد؟ (آب زدہ)	ص ۸ - مولانا ابوالمعالی (خوامن)
ص ۹ - ایک صفحہ خالی چھوڑ دیا گیا ہے	ص ۱۰ - نجم الدین ابوصالح
ص ۱۰ - ابوطاہر شروانی	ص ۱۰ - سلطان ابوسعید خان ابن سلطان محمد خدائے بندہ
ص ۱۰ - میرزا ابوبکر ابن سلطان ابوسعید	ص ۱۱ - میرزا ابراہیم ابن محمد، حاشیہ میں قلعۂ گوالیار کا ذکر ہے

ص ۱۱ - ابن لعل پسر لعلی شاہ بدخشانی

اشعار میرزا ابراہیم:

"اے لعل بدخشاں رفتی — تا بندہ چو خورشید درخشاں رفتی

در دہر چو خاتم سلیمان بودی — افسوس کہ از دست سلیماں رفتی"

ص ۱۱ - ابوعلی	ص ۱۱ - سید ابن علی
ص ۱۱ - ابن معین	ص ۱۱ - ابن خطیب
ص ۱۱ - افتخار السادات والعلما امیر نظام الدین ابوالبقائی	ص ۱۱ - خواجہ ابوالوفا
ص ۱۲ - مولانا ابراہیم کندہ	ص ۱۲ - مولانا ابدال
ص ۱۲ - مولانا ابدال اصفہانی	ص ۱۲ - قاضی ابوالبرکہ سمرقندی

ص ۱۲ - مولانا ابوالخیر سمرقندی	ص ۱۲ - خواجہ ابواسحاق
ص ۱۲ - امیر ابراہیم قانونی	ص ۱۲ - مولانا الٰہی
ص ۱۲ - شیخ ابوالواسع	ص ۱۲ - مولانا شرف الدین ابراہیم
ص ۱۳ - امیر ابوالفتح جنابدی (فتح)	ص ۱۳ - مولانا حاجی ابوالحسن
ص ۱۳ - مولانا آبی	ص ۱۳ - ابوالحسن میرزا
ص ۱۳ - بی بی آتون	ص ۱۳ - مولانا آتشی
ص ۱۳ - ابوالحامد اسکوئی (در حاشیہ)	ص ۱۳ - میرزا ابراہیم طبرانی (در حاشیہ)
ص ۱۳ - ابراہیم استرآبادی (در حاشیہ)	ص ۱۳ - سید احمد میرزا (بادشاہ زادہ طوس)

ص ۱۳ - سلطان احمد گلبرگ:

(گلبرگہ، دکن، ہند، حالیہ کرناٹک) بہمنی سلطنت کا دور، مولانا آذری اسی بادشاہ کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور بہمن نامہ تحریر کیا تھا۔

ص ۱۳ - خواجہ احمد مُجلّا	ص ۱۳ - حافظ احمد؟
ص ۱۳ - میرزا احمد دیلمی	ص ۱۴ - شیخ احمد حسن بلخی (تھوڑی جگہ چھوڑ دی گئی ہے)
ص ۱۴ - شیخ احمد موسوی	ص ۱۴ - قاضی احمد غفاری القزوینی
ص ۱۴ - امیر احمد حاجی کاشغری	ص ۱۴ - مولانا احمد اطعمہ
ص ۱۴ - سلطان احمد خطیب (در حاشیہ)	ص ۱۴ - میرزا احمد (از اولاد شیخ علاء الدولہ)
ص ۱۴ - خواجہ اختیار زادہ	ص ۱۴ - مولانا احمد طبسی (در حاشیہ)
ص ۱۵ - قاضی اختیار تربتی	ص ۱۵ - مولانا اخی
ص ۱۵ - میرزا ادھم بغدادی	ص ۱۵ - مولانا ادائی بخارائی (در حاشیہ)
ص ۱۴ - ابراہیم شاہ ادھمی	ص ۱۴ - مولانا ادھم کاشی
ص ۱۴ - مولانا ادھم قزوینی	ص ۱۴ - مولانا آدم

ص ۱۴ - شیخ جلال الدین آذری

نام شریفش علی حمزہ بن علی ملک الطوسی البیہقی (آذری کے ہندوستان آنے کا ذکر ہے)

شیخ (آذری): ''دیوان او گنج سراسر جواہرات وایں تذکرہ کہ خزینہ گنج الٰبیست گنجائش تمام آں ندارد، خلاصہ از غزلیات ایشان کہ خوبی تمام دیوان در دوست مرقوم می شود و مولف ایں تذکرہ الٰہی عماد الدین محمود الٰہی الحسینی مطلع شیخ راکہ فرمودہ شنیدہ ام'' کہ بریں طارم زراندودہ، است رخطر کہ عاقبت کار جملہ محمود است تضمین کردہ نوشتہ شد:

ندیدہ ام طربی ہیچ گہ و بی تختی   کہ بریں طارم زراندود است   آذری
نوشتہ اند الٰہی بگر باد فریاد   خطر کہ عاقبت کار جملہ محمود است

ص۱۵-بی بی آرزو بلی   ص۱۵-شیخ محمد لاہجی اسیری ''صاحب شرح گلشن راز است''

ص۱۵-صاحب قران گیتی نشان شاہ اسماعیل
ابن سلطان حیدر الصفوی الحسینی

ص۱۶-میر اسلام   ص۱۶-مولانا اسراری

ص۱۶- ہروی (؟)   ص۱۶-سید جلال الدین اشرف کاشی

ص۱۶- ملا مولانا ابراہیم (درحاشیہ)   ص۱۶-خلیفہ اسد اللہ ولد ہدایت اللہ اصفہانی (درحاشیہ)

ص۱۷-درویش اشرف   ص۱۷-خواجہ آصفی

ص۱۷-خواجہ اشرف (درحاشیہ)   ص۱۸-آدھا صفحہ چھوٹا ہوا ہے

ص۱۸-مولانا اصلی   ص۱۸-اصیل الدین محمد بن طاہر بن ابوالمعالی النجری

ص۱۸-میر سراج الدین اصلی   ص۱۸-خواجہ افضل الدین محمد کرمانی

صلی
ص۱۸-میراکی قمی (درحاشیہ)   ص۱۹-افضل بیگ

ازشعرای زمان سلطان حسین میرزا است، اما حالی با او بودہ ...... چنانکہ وقتی مولف ایں تذکرہ الٰہی ...... در ...... ہندوستان با جلیسی نشستہ بود و شیشۂ صہبا بر پای ایستادہ و حجاب عقل از پیش خاستہ ... گلہ از وضع بیغد سای خود نمودہ گفتم کہ روزگاری سالہ بر من ...... بہ گزرد ہرگز دستم بہ پیمانہ آشنا نبود امروز بتقاضائی مشرب ...... اہل ہندوستان الاکیش افتادہ ام و عمری بیہودہ می گزارم۔

ص۱۹-مولانا افسری بخاری   ص۱۹-افضل اللہ شیرازی

ص۱۹-افضل سارانی (درحاشیہ)   ص۱۹-امیر افضل (درحاشیہ)

ص۱۹-آفتی سمرقندی   ص۱۹-آفاق جلایر

ص۲۰-انجکی ؟ (غیر واضح)   ص۲۰-مولانا آگہی ......

ص۲۰-مولانا آگہی نائنی ؟   ص۲۰-مولانا افسری

ص۲۰-خواجہ افتخار   ص۲۱-میرزا الغ بیگ (پادشاہ دانش مند بود)

ص۲۱-الغ بیگ، پسر محمد صالح بیگ   ص۲۱-الف ابدال صفاہانی

ص۲۱-مولانا امانی

ازشعرای زمان ...... ہمایوں پادشاہ امانی کامران در بزم عیش است بہ عہد خسرو دوران ہمایوں

ص۲۱-مولانا امیری خراسانی   ص۲۱-صفحہ ۲۱ کے حاشیہ پر الٰہی نے بہ قلم خود تصدیق کی ہے کہ انہوں نے ۳۰ سال کی عمر میں پہلی بار ہندوستان میں مے نوشی کی، اس سے ظاہر ہے کہ تا دم تحریر الٰہی کی عمر ۳۰ برس کی تھی، یعنی یہ واقعہ ۱۰۳۳ھ کا ہے کیوں کہ الٰہی کی وفات ۱۰۶۳ھ میں واقع ہوئی تھی۔

آگہی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے الٰہی لکھتے ہیں کہ:

''طرز او فریاد می کند کہ او''

ص۲۲-امیر الدین امینی   ص۲۲-امیر کبیر نظام الدین والدعلی شیر نوائی (الٰہی نے نمونے کے طور پر ۲۵ اشعار نقل کیے ہیں)

ص۲۲-مولانا ضیاء الدین   ص۲۲-مولانا امیری؟؟

ص۲۲-خواجہ امیر بیگ نظر؟ (امیر بیگ)   ص۲۲-مولانا امان اللہ قرمستانی

ص۲۲-مولانا امان اللہ قزوینی (درحاشیہ) (شاعر و طبیب)   ص۲۲-امینی سمنامی

ص۲۲-مولانا امیدی رازی   ص۲۲-امیر محمود گیلانی

ص۲۳-اشعار   ص۲۳-اشعار

ص۲۴-اشعار   ص۲۵-(پہلا صفحہ خالی چھوڑ دیا گیا)

ص ۲۶ - مولانا غیاث الدین امیر خواند ابن شاہ بلخی

ص ۲۶ - (نام آب زدہ) ولد علی شیر (دانش مند منفرد بلخ بود)

ص ۲۷ - مولانا محمد امین بلخی

ص ۲۷ - سید قطب الدین امیر حاج آنسی

ص ۲۷ - صفحہ (ب) خالی چھوڑ دیا گیا

ص ۲۸ - مولانا آنی ہروی

ص ۲۸ - مولانا انوری بلخی

ص ۲۸ - مولانا انیسی

ص ۲۸ - مولانا انیسی خارزمی (درحاشیہ)

ص ۲۸ - انوری مشہدی

ص ۲۸ - انوری سمرقندی

ص ۲۸ - انوری بخاری

ص ۲۸ - مولانا انوار ہمدانی (درحاشیہ)

ص ۲۸ - مولانا انصافی (درحاشیہ)

ص ۲۸ - شیخ انصاری ہروی

ص ۲۸ - ملا محمد شاہ انسی قندہاری

ص ۲۸ - خواجہ اوحد المتوفی السبزواری

ص ۲۹ - سلطان اویس بن شیخ حسن نویان

ص ۳۰ - (خالی)

ص ۳۱ - (نصف خالی)

۳۲ - مولانا اہلی خراسانی

ص ۳۲ - (ب) اشعار

ص ۳۳ - مولانا اہلی شیرازی (خواجہ حافظ کی قبر کے نزدیک مدفون ہیں)

ص ۳۴ - (الف و ب) انتخاب اشعار اہلی شیرازی

ص ۳۵ - (الف و ب) انتخاب اشعار اہلی شیرازی کم وبیش ۱۰۰ اشعار

ص ۳۶ - اہلی چغتائی (صفحہ خالی)

ص ۳۶ - (ب) شائستہ رحمت الٰہی مولانا آہی

الٰہی کو آہی کے غزل کی زمین پسند آئی، انہوں نے بھی اس بحر و قافیہ میں الٰہی کے جواب میں غزل کہی

"مولف کتاب الٰہی الحسینی جواب پرداختہ و در پہلوی ہم مرقوم شد ......

آہی کی غزل کے بعد الٰہی لکھتے ہیں

راقم ایں حروف الٰہی الحسینی ...... گفتہ ...... بنگر سیر نالہ را

بردوش سبزۂ مژہ بین رقص ژالہ را بیداری کرشمہ دراز چشم نخواب ...... ؟

شب زندہ دار سینۂ من کرد نالہ را ...... بے سوز عشق فایدہ با داغ سینہ نیست

ورنہ ازیں متاع بسی ہست لالہ را طومار دل رسانیدہ ام الٰہی بہر عشق

کردم سجل بہ خط بتاں ایں قبالہ را

حرف الباء، ص ۳۷ - محمد بیرم خان ملقب بہ خان خاناں "شہید شد محمد بہرام" مادہ تاریخ از ہاتفی

ص ۳۷ - بیانی تبریزی (درحاشیہ)

ص ۳۷ - بیانی استرآبادی

ص ۳۷ - بیانی بحرآبادی (در ولایت شروان)

ص ۳۸ - میرزا پر بداق بن جہاں شاہ (ق- قاف کو غ پر پڑھیے- پرداغ)

ص ۳۹ - امیر بیخودی اسفرائنی

ص ۳۹ - بیخودی بلخی

ص ۳۹ - مولانا بیاضی استرآبادی

ص ۳۹ - مولانا پیامی ہروی

ص ۳۹ - مولانا بیکسی شستری

حرف التاء

ص ۴۰ - امیر تاج گیلانی

ص ۴۰ - مولانا تذوری ہمشیرزادہ ملا نرگسی بودہ

ص ۴۰ - تابعی ہروی ترخانی

حرف الثاء

ص ۴۰ - مولانا ثانی (خالی جگہ)

ص ۴۰ - (ب) مولانا علی کلوی ثوری بخاری

ص ۴۰ - ذکر جمیل مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی

ص ۴۱ - (ب) انتخاب اشعار جامی

ص ۴۲ - (الف+ب) انتخاب اشعار جامی

ص ۴۳ - الف (انتخاب اشعار جامی)

ص ۴۳ - (ب) مولانا محمد جانی برادر مولانا عبدالرحمٰن جامی

ص ۴۳ - سید جعفر

ص ۴۳ - سید جلال عضد ولد سید عضد است

ص ۴۴ - الف: انتخاب اشعار جلال

ص ۴۴ - مولانا جلال الدین طبیب

ص ۴۴ - جلال بن جعفر فراہانی

ص ۴۵ - خواجہ جلال الدین محمد تبریزی

ص ۴۵ - مولانا جلال الدین محمد دوانی (علامہ علمائے آفاق)

ص ۴۷ - مولانا جلالی

ص ۴۷ - شیخ جلال ہروی

ص ۴۷ - مولانا جلال بن معمائی

ص۴۷ - مولانا جلال ہندی (ڈاکٹر وجہی بڑودہ، گجرات کے دیوان مرتب کیا ہے)

ص۴۷ - سید جلال نقیب

ص۴۷ - حافظ جلال الدین محمود

ص۴۷ - پرجمالی اردستانی (پرجمالی طائفہ ہم بود)

"محرر ایں تذکرہ الٰہی ہم مشتمل، بر ذوق ایں طائفہ گفتہ تحریر نمود"

تا ہست جان در آستیں آہنگ رقص می کنم　　گر نیم دست افشاندم صد سالہ رفتار ما بود

(پرجمالی کے تذکرے میں ضمناً شیخ جمالی دہلوی کا ذکر آ گیا ہے)

ص۴۸ - شیخ جمالی دہلوی "مولف ایں تذکرہ تالیفی از شیخ جمالی دیدہ کہ در حالات ...... اثر خود کیفیت صحبت ارد با اکابر عصر خویش و کرامات و مقامات اولیای ہند وغیرہ بیان نمود نقلہای غریب ایراد کردہ" ص۴۸ - ب

ص۴۸ - (ب) شیخ جمال الدین بروجردی

ص۴۸ - مولانا جمالی کاشی ولد حاجی شاہ

ص۴۸ - مولانا جمشید منجم ہروی

ص۴۸ - جنونی ہمدانی (در حاشیہ)

ص۴۸ - جنونی اندخودی (؟) حاشیہ

ص۴۸ - جوہری (مجالس کا حوالہ)

ص۴۸ - امیر جہاں شاہ بن قرا یوسف قرا قینلوی (شہریار ترکان)

ص۴۹ - الف خواجہ شمس الدین محمد الحافظ شیرازی (دو صفحے خالی چھوڑ دیے گئے ہیں)

ص۵۰ - حافظ خاموش

ص۵۰ - مولانا حاجی فوطہ سمرقندی

ص۵۰ - حافظ حکاک کرمانی

ص۵۰ - ب: قاضی میر حسین میبدی

ص۵۱ - مولانا کمال الدین حسین الواعظ کاشفی

ص۵۱ - (مولانا حسن علی تونی کا تذکرہ کر کے کاٹ دیا ہے)

ص۵۱ - ب: مولانا حکیمی خراسانی

ص۵۱ - درویش حیدر تو بیانی نزد ہرات (مدتہا در ہند بود و در اوایل اکبر بادشاہ، ملک المنجمین راہجوی نمود)

ص۵۱ - مولانا حیدر کلوچ ہروی (کلیچہ پز ہروی بود)

ص۵۱ - سید حزنی

ص۵۲ - (ب) خواجہ نجم الدین میر حسن دہلوی کا ذکر کاٹ دیا گیا ہے، البتہ اشعار محفوظ ہیں، ہجو مطہر بسیار گفتہ

ص۵۲ - حبیب اللہ (قزوین) ولد سر برہنہ

ص۵۲ - حبی اصفہانی (تذکرہ سامی)

ص۵۲ - حجابی دختر بدر الدین بحوالہ تذکرۃ النساء

ص۵۳ - اشعار خواجہ میر حسن

ص۵۳ - (الف و ب)

ص۵۴ - ذکر جمیل شہریار جنت ماورا، میرزا ابوالبقا سلطان حسین تبریزی بایقرا ابن عمر شیخ پدر بابر شاہ تبریز کے قریب، بابا الٰہی ایک دیہات کا نام ہے

ص۵۵ - مولانا میر حسن معمائی

ص۵۵ - (ب) سید حسن متکلم نیشاپوری

ص۵۵ - خواجہ حسن قندھاری

ص۵۵ - سید حسن شہاب

ص۵۵ - حسامی قلندر قراکول، بخارا

ص۵۶ - مولانا احسن شاہ ہروی

ص۵۶ - ب: مولانا حیرانی ہمدانی (سامی) (مثنوی بہرام و ناہید نوشتہ)

۵۷ - حیرتی قزوینی

ص۵۷ - مولانا حیرتی مروی

ص۵۷ - (ب) مولانا خالدی حصاری

ص۵۷ - مولانا خرمی (؟) ہروی

ص۵۷ - خسرو سعد گرد و خسرو ثانی

ص۵۷ - خاوری سمرقندی (حاشیہ)

ص۵۷ - خاکی از مریدان خواجہ کرسوی (حاشیہ)

ص۵۷ - مولانا خضری

ص۵۷ - محمد خلوتی

ص۵۷ - ب: سلطان خلیل بن میران شاہ بن امیر تیمور صاحب قران

ص۵۸ - الف رب: دربارۂ سلطان خلیل

ص۵۹ - خلیل کاشانی (حاشیہ) الف

ص۵۹ - خلقی بخاری

ص۵۹ - خلقی تبریزی

ص۵۹ - ب: غیاث الدین خواند میر بن ہمام الدین امیر خواند

ص۵۹ - (در فن تاریخ بے مثل بود)

ص۵۹ - ب: زبدۃ الفصحا خواجوی کرمانی

ص۶۰ - انتخاب اشعار خواجو

ص۶۱ - الف: انتخاب اشعار خواجو

ص۶۱ - ب: مولانا خیالی بخاری

ص۶۱ - خیالی ہروی

ص۶۱ - مولانا خیالی خجندی

حرف الدال

ص۶۲ - الف: شاہ داعی اللہ شیرازی الٰہی شاہ داعی کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں کہ

''صاحب این تذکرہ الٰہی در سال ہزار و دہ ۱۰۱۰ھ بطلب علم و کمال بشیراز رفتہ بود سہ و نیم (۳½) سال تحصیل معارف در آں خطہ پاک نمودہ بطوف مزارات متبرکہ آنجا خصوص طواف مزار فایض الانوار ایشان رسید و دیوان وی را در ہمان بقعۂ انتخاب نمودہ لیکن منتخبات ...... دوران از دست رفت و کلیات و یرا غزلیات، قصاید، مثنویات، نزدیک چہل ہزار بیت گفتہ اند''۔

ص ۶۲ - (ب) مولانا داغی سرخسی — ص ۶۲ - داغی ہروی

ص ۶۲ - مولانا داغی اردستانی — ص ۶۲ - مولانا دانشی بخاری (مشک فروش)

ص ۶۳ - دختر قاضی خیر النساء خاتون (شاعرہ) — ص ۶۳ - دختر امیر یادگار دوغ آبادی

ص ۶۳ - درویش دھکی قزوینی رودھکی محلہ ایست در قزوین

ص ۶۳ - (ب) اشعار دھکی: (شاید یہ کسی اور کے نام سے معروف ہیں)

اے باد صبا بگو بجامی — کای و زد سخنوران نامی
بروی اشعار کہنہ و نو — از سعدی و انوری و خسرو
اکنوں کہ سر حجاز داری — آہنگ حجاز ساز داری
دیوان ظہیر فاریابی — در مکہ بد زد اگر بیانی

(غالباً انوری)

ص ۶۳ - مولانا درویش روغن گر — ص ۶۴ - خواجہ درویش برادر خواجہ مظفر (حاشیہ)

ص ۶۴ - مولانا درویش سرخسی (نمد مالی میکرد) — ص ۶۴ - مولانا درویش تربتی

ص ۶۴ - مولانا دعائی مشہدی — ص ۶۴ - میر دوری: خوش نویس گفتہ اند کہ از ہری است و از زمان ہمایوں تا ایام دولت اکبر شاہی در ہند بود و بخطاب کاتب الملکی شرف اختصاص یافتہ

ص ۶۴ - مولانا دوست محمد جانی، سبزوار خراسان است — ص ۶۴ - مولانا دوست اسفرائنی

ص ۶۴ - میر دوست حسن — ص ۶۴ - میر دوست خاری از امرازادہ ہای چغتائی بودہ

ص ۶۵ - الف: بابر میرزا — ص ۶۵ - دوست محمد سلطان بن نوروز احمد خان

ص ۶۵ - بختیار الغازی السمرقندی، دولت شاہ علائی (مورخان زمان)

ص ۶۵ - ب: نویسندۂ تذکرہ دولت شاہ — ص ۶۵ - ب: دہقانی از ولایت زی

ص ۶۵ دیوانہ نیشاپوری — ص ۶۶ - حرف الذال

ص ۶۶ - ب: مولانا ذاتی — ص ۶۶ - ذاتی لاری (تذکرہ سامی)

ص ۶۶ - ذاتی کبابی — ص ۶۶ - مولانا ذہنی تبریزی

ص ۶۶ - ب: ذہنی کاغذ فروش — ص ۶۶ - ذہنی اتو خانی

ص ۶۶ - حرف الراء — ص ۶۶ - امیر رازی ہروی

ص ۶۶ - مولانا رازی شیرازی — ص ۶۶ - رازی بغدادی

ص ۶۶ - ب: راحی خواجہ حسن (حاشیہ) — ص ۶۷ - مولانا شرف الدین را ...... تبریزی؟

ص ۶۷ - فخر الدین محمد الاسری؟ — ص ۶۷ - الف: پورا صفحہ آب زدہ ہے

ص ۶۷ - ب: انتخاب اشعار . — ص ۶۸ - الف: خواجہ سیف الدین محمود در جامی اصفہانی

ص ۶۸ - ب: انتخاب اشعار خواجہ — ص ۶۹ - مولانا رحمانی خراسانی

ص ۶۹ - رشید الدین احمد کارزونی — ص ۶۹ - مولانا رسوائی ہمدانی

ص ۶۹ - الف: رضائی سبزواری — ص ۶۹ - رضای زار جربتی (خالی جگہ)

ص ۶۹ - امیر رضائی — ص ۶۹ - رحمتی زادہ کابلی (در حاشیہ)

ص ۶۹ - ب: مولانا جلال رفقی — ص ۶۹ - خواجہ رکن الدین صاین سمنانی

ص ۷۰ - الف: انتخاب اشعار صاین — ص ۷۰ - ب: روحی سمرقندی (امیر روحی و روحی ہرمزی)

ص ۷۰ - روحانی و نیز تخلص رہای — ص ۷۰ - رونقی بخاری

ص ۷۰ - ریاضی محولاتی — ص ۷۰ - روح عطائی؟ حاشیہ (مولدش جوار دوان است)

ص ۷۰ - رہی سمرقندی — ص ۷۱ - الف: ریاضی محولاتی اصلاً ریاضی زاوئی است (سام ورازگفتہ) مثنوی ہشت ہزار بیت بنام تاریخ فتح خراسان دیوان ریاضی دو ہزار بیت دارد متوفی ۹۲۱

ص ۷۱ - ب: (خالی)

حرف الزاء — ص ۷۲ - الف: زاہدی

ص ۷۲ - زاری مشہدی — ص ۷۲ - زاری سبزواری

ص ۷۲ - ذلالی (قصیدہ گو) — ص ۷۲ - زلالی خراسانی

ص۷۲- زوجہ ہلالی (بسیار جمیلہ وصاحب طبیعت بود بادشاہ اسماعیل نائبی باو مائل شد

ص۷۲- زینی مشہدی

ص۷۲-ب: شیخ زین الدین خوافی

ص۷۲- شیخ زین الدین (جن کا تعلق بابر بادشاہ سے ہے) حاشیہ

حرف السین

ص۷۳- میرزا شاہ حسین ساقی اصفہانی

ص۷۳- مولانا سایل ہمدانی (از موضع آہ دماوند)

ص۷۴-ب: مولانا سائی سمرقندی

ص۷۵-الف: حافظ سروی (قامت بلند داشتہ مانند سرو) (دوست ہلالی بود)

ص۷۵- مولانا سروری

ص۷۵- نظام الدین محمود قمری (بحوالہ رشید وطواط در حقایق السحر گفتہ)

ص۷۶- حافظ سعد گل زید شاہ قاسم انوار

ص۷۶- مولانا سعیدی غلامی

ص۷۲- مولانا نازنی

ص۷۲- شیخ زین الدین ابوبکر تایبادی

ص۷۲- مولانا زیرکی

ص۷۲- (ملک الکلام ابن عماد ...... فاضل بودہ ...... اما در شیراز

ص۷۳-الف: ابوالمکارم سام مرزای بن شاہ اسماعیل بن سلطان حیدر الصفوی (شہزادہ) مصنف تذکرۃ الشعرا

ص۷۳- سائلی توشجی

ص۷۴-الف: آب زدہ ہے (بہ مشکل مولانا ساحری؟ پڑھا جاسکتا ہے)

ص۷۴- میرزا شاہ حسین ارغون سپاہی تخلص

ص۷۵- مولانا سردی ولد حافظ میراثی (واقعہ نویس)

ص۷۵- سراج الدین قمری (قزوینی)

ص۷۶- سرخ وداعی (بحوالہ تقی الدین اوحدی)؟ گفتہ

ص۷۶-ب: خواجہ سعد گل شیرازی

ص۷۶- ابوالفتح سلطان سعید خاں خواجہ حسن نثاری

ص۷۶- درویش سقائی چغتائی بخارائی در ہند و سندھ بعد ازاں سرانديپ رفت، در زمان ہمایوں بادشاہ الٰہی دیوان سقائی دیدہ بود در سرانديپ

فوت شد (عہد ہمایوں میں بچہ سقہ کا واقعہ مشہور ہے)

ص۷۷-الف: صرف عنوانات ہیں

ص۷۷- حافظ سلطان علی اوبہی

ص۷۷- سلطان سلیم بن سلطان بایزید

ص۷۸- سلطان محمود میرزا ولد ابوسعید میرزا ظلی تخلص می کرد

ص۷۸- خواجہ سلمان ساوجی ولد خواجہ علاء الدین محمد ساوجی (کسی تسامح کے باعث سلمان کے اشعار میں خیام کی رباعی شامل ہوگئی ہے

آمد سحری ندا ز میخانہ ما

زان پیش کہ پر کنند پیمانہ ما

ص۸۰- مولانا حسن علی سلیمی

ص۸۰- بابا سودائی ابیوردی

ص۷۷- سلطان حسن لاہیجان

ص۷۷-ب: مولانا سلطان علی مشہدی (خوش نویس)

ص۷۸- سلطان مسعود میرزا پسر سلطان محمود غازی تخلص میکرد

ص۸۰- مولف این تذکرہ الٰہی الحسینی الہمدانی این رباعی خواجہ سلمان را متراوی ساختہ حسن ادائی اورا نیکوتر از اول پرداختہ کہ برعارفان روا

خواہم شبلی چنانکہ تو دانی و من

دور از کہ و مہ تو دانی و من

من بزید بسترت بخوابانم ز تو

آن کہ .... را بخوابانی و من الٰہی ہمدانی

خواہم شبلی چنانکہ تو دانی و من

بزمی کہ درآن بزم تو دانی و من

من بزید بسترت خوابانم و تو

آن کس کہ مست را بخوابانی و من سلمان ساوجی

ص۸۰- مولانا شاہ محمد سلامی ہروی

ص۸۱- امیر نظام الدین شیخم سہیلی (چغتائی بزرگ)

(مولانا حسین کاشفی نے انوار سہیلی امیر نظام الدین کے نام معنون کی)

ص ۸۱- مولانا یمی (در شعر معما نظیر نداشت)

ص ۸۲- مولف ایں تذکرہ الٰہی الٰہی الحسینی رباعی در صفت اشتہا گفتہ بود بجہت مناسبت مقام دررقم آورد

ہر گوشہ کہ اشتہای سوبان زدہ است
در کشور معدۂ تو جمع آمدہ است
از بس کہ نخاییدہ و بری تیکہ فرو
ہر لقمہ ز دست تو دل خونشدہ ایست

ص ۸۲- ب: امیر یادگار بیگ سیفی، چنانچہ مولف ایں تذکرہ الٰہی - حاشیہ، مولف الٰہی الحسینی گوید در فقر اگر ہیچ مرادی ندہد دست

ص ۸۲- سیفی بخاری (ماہر علم عروض)

ص ۸۳- انتخاب اشعار سیفی (آدھا خالی)

ص ۸۳- ب: حرف الشین

الطاف الٰہی امیر شاہی سبزواری:

نوٹ: (حاشیہ میں الٰہی نے "حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری و شیخ یحییٰ اسرائیل کے ہندوستان جانے کا ذکر کیا ہے)

ص ۸۴- الف و ب: (در بارۂ شاہی)

ص ۸۵- الف: (خالی)

ص ۸۵- ب: میرزا شاہ حسین صفاہانی

ص ۸۶- الف: شاہ نیک نام خان براق خان بن ابوالخیر خان

ص ۸۶- ب: نیم خالی، خواجہ عبدالقادر مراغہ ای

ص ۸۷- سیف الملوک دماوندی شجاعی

ص ۸۷- مولانا شرف خیابانی

ص ۸۷- مولانا شرف الدین علی یزدی

ص ۸۷- ب: مولانا شرف الدین علی بافقی

ص ۸۸- الف: انتخاب اشعار بافقی

ص ۸۸- ب: میرزا اشرف بن قاضی

جہان قزوینی

ص ۸۹- الف: امیر سید شریف علامہ جرجانی (خالی جگہ ہے)

ص ۸۹- ب: حرف الصاد

ص ۸۹- مولانا صادق حلوائی سمرقندی مدتہا در لاہور بود کابل کے بادشاہ مرزا محمد حکیم بن ہمایوں بادشاہ کے ساتھ تھے

ص ۹۰- در ذکر حلوائی: "چوں اکبر بادشاہ بارادہ انتقام برسر کابل باسپاہ گران آمد میرزا محمد حکیم بجانب ہزار حیات فرار شد و مولوی حلوائی بجانب ماوراء النہر گریخت"

ص ۹۰- سید جعفر صادق

ص ۹۰- میر محمد صالح ہروی

ص ۹۰- ب: مولانا صالح بدخشی

ص ۹۰- خواجہ کمال الدین حسین صبوری

ص ۹۰- باباصالحی یزدی (حاشیہ)

ص ۹۱- مولانا صدقی ہروی

ص ۹۱- میر صدر الدین محمد (حاشیہ)

ص ۹۱- مولانا سلطان محمد صدقی استرآبادی

ص ۹۱- ملا محمد حسین صدقی (حاشیہ)

ص ۹۱- ب: قاضی صفی الدین عینی

ص ۹۱- شاہ صفی الدین نوربخشی

ص ۹۱- صفائی صفاہانی

ص ۹۱- صفائی خراسانی

ص ۹۱- باباصفائی قمی [1]

تذکرۂ الٰہی کے ممدوحین الف: شہنشاہ نورالدین جہاں گیر ۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ء، ب: شہنشاہ شاہ جہاں ۱۶۲۷ تا ۱۶۵۶ء، ج: میرزا غازی ترخان وقاری پیدائش ۶-۹۹۷ھ، میرزا غازی خان وقاری میرزا جانی بیگ کا فرزند تھا، عقیدتاً اثنا عشری تھا، میرزا جانی بیگ نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کیا، تاریخ طاہری سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا مولانا اسحاق بکھری سے تعلیم حاصل کی تھی، مولانا اسد ایرانی کی علمی لیاقت دیکھ کر میرزا نے اسے اپنا مصاحب بنایا، جاگیر دی اور اپنا استاد بنایا، میرزا غازی ریاضی اور علم نجوم سے بھی واقف تھا، ماثر رحیمی کا مولف رقم طراز ہے کہ:

"فضلا و علما دوست بود و ہمیشہ صحبت ایشاں می داشت و علما را در حضور بہ بحث علم معقول می داشت و خود نیز ملکہ واستعداد تمام می داشت کہ آنچہ علمای گفتند

---

[1] معارف: یہ فہرست نا تمام معلوم ہوتی ہے۔

طرفیت فہمیدہ منصف می شد"۔ (جلد دوم، ص ۲۵۲)

صاحب میخانہ میرزا کا ہم عصر تھا، اس نے میرزا کی شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"میرزائے ترخان جامع الفضائل والکمالات بودہ، شعرش کہ از شعرائے این جزو زمان نسبت"۔ (ص ۲۲۷، لاہور)

مغل شہنشاہ جہاں گیر نے توزک میں میرزا ترخان کو نوازتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میرزا غازی فی الجملہ کمال داشت شعر ہم خوب می گفت"۔ (توزک، نول کشور، ص ۶۴)

میرزا غازی کا دیوان ۵ ہزار اشعار پر مشتمل تھا، جواب ناپید ہے، میرزا نے ۲۶/۲۵ سال کی عمر میں وفات پائی، سال وفات ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء ہے، نعش قندھار سے لاکر ٹھٹہ (ٹھٹہ) کے مسکلی قبرستان میں دفن کی گئی۔

د: ظفر خان احسن[1]: شاہی امیر خواجہ احسان اللہ ولد خواجہ ابوالحسن کا خطاب ظفر خان اور تخلص احسن تھا، نہایت بہادر جنگجو، صاحب سیف، قلم تھا، شعر وادب سے خصوصی لگاؤ رکھتا تھا، فوج کشی اور ملکی انتظام کے بعد سارا وقت معارف پروری اور شعر انوازی میں گزارتا تھا، اسے فن عروض پر کامل دست گاہ تھی، اس لیے نقد شعر و شعر فہمی کا سلیقہ رکھتا تھا، عہد شاہ جہانی کے اکثر شعرا اس کی سرپرستی اور نوازشوں سے فیض یاب ہو چکے تھے، اس کے لائق فرزند عنایت اللہ نے شاہ جہاں نامہ تحریر کیا تھا، ظفر خان ۳ ہزاری ذات کے منصب پر فائز تھا، ۱۰۷۳ھ م ۱۶۶۲ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

میر الٰہی نے احسن کے سات سال پہلے وفات پائی تھی، شاعری سے فطری لگاؤ کے باعث ان کو معاصر شعرا کی صحبت عزیز تھی، چنانچہ احسن نے اپنے ہم عصر شعرا کا کلام خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ترتیب دیا تھا، سرخوش، خوشگو اور آزاد بلگرامی نے اس امر کی تصدیق کی ہے۔

---

[1] مرحوم اسلم خان، پروفیسر شعبۂ فارسی دہلی یونی ورسٹی دہلی نے "ظفر خان احسن کی حیات اور فن پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے، البتہ احسن کا تذکرہ بنام "مرقع" ناپید ہے۔

ہ: مہابت خان - اول: اصل نام زمانہ بیگ بن غور بیگ تھا، کابل آبائی وطن تھا، عہد اکبر میں مہابت خان کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری ذات کے منصب پر فائز ہوا، اپنی قابلیت اور جنگی فتوحات کی وجہ سے شہرت پائی اور اعلا کارکردگی کے باعث ترقی کی منزلیں طے کیں، عہد جہاں گیر ۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء، بادشاہ کا مشیر خاص بن گیا، نور جہاں بیگم کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے اسے حاسد بنادیا، ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۶ء میں مہابت خان نے شہنشاہ جہاں گیر کو شاہی خیمہ میں نظر بند کر دیا۔

نور جہاں نے مہابت خان کی نگران فوج سے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور بادشاہ کو رہا کرلیا، کچھ دنوں تک اس پر شاہی عتاب نازل رہا لیکن بعد میں اس کو جہاں گیر نے معاف کر دیا، شاہ جہاں نے اپنے دوسرے سال جلوس ۱۰۳۷ھ م ۱۶۲۸ء میں مہابت خان کو دہلی کا حاکم نامزد کیا، مہابت خان دکن کی مہم پر فتح کے پرچم لہراتے ہوئے ۱۰۴۴ھ م ۱۶۳۴ء میں دار فانی کو روانہ ہوا، نعش مبرک دہلی لاکر دفنائی گئی۔

مہابت خان (دوم) ۱۰۴۴ھ م ۱۶۳۴ء، تا ۱۰۸۵ھ م ۱۶۷۴ء: مہابت خان اول کے انتقام کے بعد ان کا دوسرا بیٹا لہراسپ مہابت خان دوم کے خطاب سے نوازا گیا، مہابت خان دوم بھی دکن میں مغلیہ فوجوں کا کمان دار رہا، اس نے ۱۰۸۵ھ م ۱۶۷۴ء میں وفات پائی۔

میر الٰہی نے مہابت خان اول کے یہاں دو سال اور بقیہ کچھ سال مہابت خان دوم کے یہاں گزارے۔

منابع

۱- آتش کدہ از آذر، ص ۱۱۵/ص ۵۹۸۔ ۲- بزم تیموریہ از سید صباح الدین عبدالرحمن، مملوکہ مہاراشٹرا کالج بمبئی۔ ۳- خلاصۃ الافکار از ابو طالب۔ ۴- ریاض الشعرا، ص ۴۰۔ ۵- ۶- عرفات العاشقین از تقی اوحدی، بانکی پور، ص ۱۲۲/ ۱۲۲۔ ۶- عمل صالح (پادشاہ نامہ) از محمد صالح کنبوہ لاہوری، ج ۳، ص ۴۱۰۔ ۷- تذکرۂ ہفت آسمان، ص ۱۳۶/۷۔ ۸- کلیات غنی کشمیری، مطبوعہ ایران، مملوکہ مہاراشٹرا کالج لائبریری، بمبئی۔ ۹- کلمات الشعرا بحوالہ تاریخ تذکرہ نویسی فارسی از گلچین معانی۔ ۱۰- مراۃ الخیال بحوالہ تاریخ تذکرہ نویسی فارسی از گلچین معانی۔ ۱۱- ماثر رحیمی ملا عبدالقادر

نہاوندی، ج ۳،ص ۷۸۱/۷۸۸ ـ ۱۲-ماثرالامرا از شاہنواز خان، ص ۳۷۴ ـ ۱۳-مراۃ جہاں نما از سراج الدین علی خان آرزو ـ ۱۴-مخزن الغرائب، ش ۱۱۳ ـ ۱۵-معارف، اعظم گڈھ، شمارہ اکتوبر ۱۹۷۴ء ـ ۱۶-تذکرہ نویسی در ہندو پاکستان از نقوی، ص ۱۹۱ ـ ۱۷-تاریخ تذکرہ نویسی فارسی از گلچین معانی، مہاراشٹرا کالج لائبریری بمبئی ۸ ـ ۱۸-منتخب الاشعار از جتلا، ص ۴۶، بحوالہ ترخان اور ان کا بزم ادب از حسام الدین راشدی ـ ۱۹-تاریخ واقعیات کشمیر، ص ۱۳۲، بحوالہ ترخان اور ان کا بزم ادب از حسام الدین راشدی ـ ۲۰-توزک جہاں گیری از نور الدین جہاں گیر بادشاہ (اردو ترجمہ) از مولوی احمد علی رام پوری، ۲۰۰۱ء دہلی ـ ۲۰-اودھ کیٹلاگ از ڈاکٹر اشپرنگر، ص ۶۶/ ص ۸۷ برلن لائبریری برلن ـ ۲۱-فہرست مخطوطات فارسی از چارلس ریو، برٹش میوزیم، لندن، ج ۲/ص ۶۵۷، ج ۳ ـ ۲۲-فہرست مخطوطات فارسی صولت حسین لائبریری، رام پور، شمارہ ۳۴۸۷ ـ ۲۳-فہرست مخطوطات فارسی از اسٹورے، ص ۸۱۶ ـ ۲۴-تزک جہاں گیر، مطبوعہ فارسی، مہاراشٹرا کالج بمبئی ۸ ـ ۲۵-عہد جہاں گیر و شاہ جہاں، نجیب الرحمٰن (انگریزی) ـ ۲۶-تذکرہ شعرائے کشمیر از سید حسام الدین راشدی ـ ۲۷-مرزا غازی بیگ ترخان اور ان کا بزم ادب از سید حسام الدین راشدی ـ ۲۸-اورینٹل ببلوگرافی از بیل، ص ۲۹۹/۴۲۳ ـ ۲۹-تذکرہ نمبر، نگار، مملوکہ مہاراشٹرا کالج بمبئی ۸ ـ ۳۰-تذکرہ والہ داغستانی بحوالہ گلچین معانی (تاریخ تذکرہ نویسی فارسی) تہران ـ ۳۱-تذکرہ مجمع النفائس، بحوالہ گلچین معانی (تاریخ تذکرہ نویسی فارسی) تہران ـ ۳۲-دیوان الٰہی، عماد الدین محمود حسینی، زیراکس از برلن لائبریری برلن (راقم کی تحویل میں ہے) ـ ۳۳-میر صدر الدین الٰہی اسد آبادی (ہمدان) از فرہنگ سخنوران خیام پور، ص ۸۵ ـ
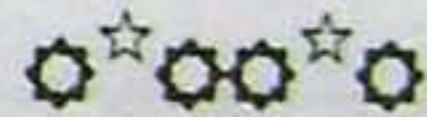
اسلامی جمہوریہ چیچینیا

از:- کلیم صفات اصلاحی ☆

دنیا کے بڑے اور طاقت ور ملکوں کی نگاہ میں وہ ممالک دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں جو اپنے ملکوں پر غیر ملکیوں کے قبضہ و تسلط اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائیں، اپنے حق کا مطالبہ کریں اور جبر و استحصال کی تائید نہ کریں، اس بنا پر زبردست ممالک کم زور ملکوں پر ہر ظلم و جور روا رکھتے ہیں اور ان کو اس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی مدافعت و تحفظ کر سکیں اور اگر وہ اس طرح کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں اس کی پاداش میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور سہولتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے، بالآخر وہ اس سے تنگ ہو کر اپنے دفاع اور جائز مطالبات کے لیے جب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو روا و ناروا اور مناسب و نامناسب ہر طرح کا قدم اٹھانے لگتے ہیں اور اپنے مقصد کی تکمیل میں وہ اندھے بہرے ہو جاتے ہیں، اس طرح بے گناہ اور معصوم لوگ بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں، دراصل گوریلا مہمیں اور دہشت گردانہ کارروائیاں حق تلفیوں کے ردعمل کی بنا پر وجود میں آتی ہیں، فلسطین، عراق، بوسینیا ہرزیگوینا، افغانستان، کوسوو، البانیہ اور چیچینیا وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں، چیچینیا کا علاقہ تقریباً دو ڈھائی صدیوں سے روسی جبر و تسلط اور ظلم و ستم کے خلاف نبرد آزما ہے، اسی لیے وہ مسلسل روسی جارحیت کا شکار اور اس کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔

اس طرح کی صورت حال سے جب کم زور اور مظلوم قومیں دوچار ہوتی ہیں تو تعلیمی، ثقافتی اقتصادی اور سائنسی میدانوں میں ان کی پس ماندگی بڑھتی ہی جاتی ہے اور انہیں اس کا موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنے ملک و وطن کی ترقی اور خود اپنی مرفہ الحالی کا نقشہ بنائیں اور جدید تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی سے بہرہ ور ہو سکیں اور اپنے تہذیبی و معاشرتی اصلاح کی فکر کریں اور یہی استعماری طاقتوں کا مقصد بھی ہوتا ہے کہ انہیں اتنا مجبور و بے بس کر دیا جائے کہ وہ اپنی آزادی و خودداری سے دست بردار

☆ ریسرچ اسکالر دارالمصنفین، اعظم گڈھ۔

ہوکران کے جابرانہ شکنجے سے نہ نکل سکیں اور ہمیشہ ان سے رحم وکرم کی بھیک مانگتی رہیں، زیر نظر مضمون میں روسی استبداد کا تختۂ مشق بنی ہوئی اسلامی جمہوریہ چیچنیا کے حالات کسی قدر تفصیل سے قلم بند کرنے کا ارادہ تھا مگر ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں وہ اس کے متعلق مواد و معلومات سے خالی ہیں، حسن اتفاق سے ڈاکٹر فہد العصیمی کی ایک کتاب "ماساۃ اخواننا المسلمین فی الشیشان" ہمارے ہاتھ لگی جو چیچنیا پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے اور بعض دوسرے ذرائع سے جو معلومات فراہم کیے جاسکے ہیں انہیں نذر قارئین کیا جاتا ہے۔

چیچن کی تحقیق چیچنیا کا اصلی ملکی نام نخچیو (Nekhcho) یا نخچی ہے، ترکی میں چاچان اور عربی میں اس کو شیشان کہتے ہیں، یہ وسطی قفقاز میں دریائے سنجہ (Sunja) اور دریائے تیرک (Terek) کے جنوبی معاون دریاؤں کے ساحلوں اور پہاڑوں کے دامن میں بود و باش رکھنے والے مسلمانوں کا نام ہے، چیچن نام روسیوں کا دیا ہوا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب روسی فوجیں اس علاقے میں داخل ہوئیں تو چیچن خیلوں (Clans) میں منقسم تھے اور ہر جگہ چالیس سے پچاس افراد تک کا ایک بڑا سر قبیلی خاندان تھا اور بعض خیل قبیلوں کی صورت میں متحد تھے، جیسے مچک، اچکری، اوخ (Aukh)، کست، ترزن، قرہ بغ، غلغای جس سے انگش قوم پیدا ہوئی، روسیوں نے دریائے ارغون پر واقع چیچن "اول" کی نسبت سے جہاں روسی فوجی دستوں اور مقامی باشندوں کے درمیان جنگ ہوئی، ان تمام قبیلوں کو "چیچن" کے نام سے منسوب کیا۔ (۱) پہلے چیچن میں اعلا و ادنا کی تفریق نسلی اعتبار سے موجود تھی لیکن بعد میں چیچن کی طبقاتی تقسیم ختم ہوگئی اور تمام چیچن اپنے آپ کو "ازدن" یعنی اشراف سمجھنے لگے۔

جائے وقوع، رقبہ و آبادی چیچنیا قفقاز کے شمال مشرق میں واقع ہے، اس کے شمال و مشرق میں داغستان، مغرب میں انقوش اور شمالی انگشتیا اور جنوب میں جارجیا ہے، اس کا کل رقبہ ۱۳۳۰۰ مربع کلومیٹر ہے، دسمبر ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۱۴۵۰۰۰۰ ہے (۲)، یہ بھی واضح رہے کہ چیچنیا کے معتد بہ باشندے مختلف اوقات میں متعدد قریبی ملکوں میں قابض حکم رانوں

(۱) یہ تفصیل اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۷۴۴-۴۵ اور سوویت یونین کا زوال نظریہ، عمل، رد عمل، ص ۱۶۹ و ماساۃ اخواننا المسلمین فی الشیشان، ص ۷ و مابعد سے ماخوذ ہیں۔ (۲) ماساۃ اخواننا المسلمین فی الشیشان، ص ۷

کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر ہجرت کر گئے ہیں، ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ کے قریب ترکی، ۱۵ ہزار اردن، ۷ ہزار شام اور ۴۹ ہزار داغستان میں پناہ گزیں ہیں۔

نسل اور باشندوں کی نوعیت مورخین کی تصریح کے مطابق نسلاً چیچن شمالی قفقازی کوہستانی قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں الائن نے درہ دریال اور وادی شر و ارغون کے درمیان پہاڑوں کی طرف جلاوطن کردیا تھا (۱)، ممکن ہے یہ قفقازی قبایل ہوں اور بعد میں انگش (Ingush) بتزبی (Batzabi) اور کشن (Kistin) سے اختلاط کے بعد چیچن کہلانے لگے ہوں۔

چیچنیا کی کل آبادی میں اکثریت چیچن قوم کی ہے، ان کے علاوہ ۳ لاکھ روسی، ۱ لاکھ انگش جو نسلاً چیچن سے زیادہ قریب ہیں، ۲۰ ہزار لوگوں کا تعلق قاموق، نوکائی، آوار، لاق اور دارکون وغیرہ داغستانی قبایل سے ہے، ۱۴ ہزار ارمنی، ۱۴ ہزار یوکرین، ۵ ہزار تاتاری، ۵ ہزار یہودی، ۴ ہزار ترکی ہیں، موخر الذکر دونوں قوموں کی اکثریت کو ۱۹۹۸ء میں روس نے وسطی ایشیا سے لاکر آباد کیا ہے (۲)۔

زبان چیچن زبان اصل میں دو بولیوں میں منقسم ہے، پہاڑوں (بالائی چیچن) اور میدانی علاقوں (نشیبی چیچن) میں بولی جانے والی زبان چیرلوے (Caberloy) کہلاتی ہے، اس کا رسم الخط لاطینی ہے، عربی رسم الخط میں بھی اس کو لکھنے اور ڈھالنے کی کوشش ہوئی، چیچن اور انگش اگرچہ دو قومیں ہیں تاہم ان میں اس قدر گہرے روابط ہیں کہ وہ ایک جیسی زبانیں بولتے ہیں، یعنی ان میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے، ۱۹۲۳ء میں انگش کو بھی لاطینی رسم الخط کا لبادہ پہنادیا گیا، ۱۹۳۴ء میں جب چیچن اور انگش علاقے ایک دوسرے میں ضم کیے گئے تو دونوں قوموں کے رسم الخط اور زبانوں کو ملاکر چیچن انگش زبان کا نام دیا گیا، ۱۹۳۸ء سے انہیں سریلی (Cyrillie) خط میں لکھا جاتا تھا مگر جب دونوں علاقوں کو الگ کیا گیا تو سرکاری طور پر دونوں کی اپنی اپنی علاحدہ زبان بنائی گئی (۳)، اس وقت چیچنیا کی سرکاری زبان چیچنیائی ہے (۴)، جو بہ ظاہر ہے لاطینی رسم الخط میں لکھی جاتی ہوگی، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے بیان کے مطابق چیچن انتہائی سادہ اور صاف زبان بولتے ہیں مگر ان

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۷۴۴۔ (۲) ماساۃ اخواننا المسلمین فی الشیشان، ص ۷۔ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۷۴۷۔ (۴) ماساۃ اخواننا المسلمین فی الشیشان، ص ۷۔

کے لیے بیس سے بھی زاید ہیں (۱)۔

پیداوار اور وسایل معیشت

نہر تیرک (۲) کے ساحل کے قریب ہونے کی وجہ سے چیچنیا کا علاقہ سرسبز و شاداب ہے، گیہوں، جو، چاول، گنا، پھل اور میوہ جات وغیرہ کی کاشت بہت اچھی ہوتی ہے، ساحل تیرک کے باشندے زیادہ تر اسی زراعت کے پیشے سے وابستہ ہیں، چیچنیا کی اقتصادی خوش حالی اور ذرایع آمدنی میں پٹرول بہت اہم ہے اور جگہ جگہ پٹرول کیمیکل انڈسٹریز یعنی تیل نکالنے اور صاف کرنے کی مشینیں نصب ہیں دارالسلطنت گروزنی، غودرمیس، مالکوبیک وغیرہ خاص طور پر اس کے لیے مشہور و معروف ہیں، چیچنیا کی پٹرول پایپ لائنیں بحر قزوین (کیسپین) کے کنارے داغستان میں قلعہ مجہ اور بحر اسود کے کنارے (دوآبہ) وغیرہ تک بچھی ہوئی ہیں (۳)، لوہے، ہوائی جہاز، طبی و جنگی آلات تیار کرنے، سیمنٹ، اینٹ اور سوتی و اونی کپڑوں کی صنعت میں بھی چیچنیا کے باشندے دل چسپی رکھتے ہیں۔

چیچن کا قدیم مذہب

مورخین کا بیان ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے قبل تک کی چیچن کی کوئی مستند و محقق تاریخ موجود نہیں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق سولہویں صدی عیسوی میں ان کے گلہ بان قبیلوں نے پہاڑوں سے اتر کر اس علاقہ میں بود و باش اختیار کی جو آج کل چیچنیا کے ملک کا شمالی حصہ ہے لیکن ان کے مذہب کے بارے میں وہ کچھ نہیں بتاتا تاہم بعد کے محققین نے لکھا ہے کہ چیچنیا کی سرزمین آٹھویں صدی عیسوی ہی میں مذہب اسلام سے آشنا ہوچکی تھی، جس کی تفصیل آیندہ سطور میں آئے گی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق چیچن کی مغربی ہم سایہ قوم انگش میں جو چیچن سے ہر لحاظ سے قریب ہے، بیسوی صدی عیسوی کے آغاز تک مظاہر پرستی موجود تھی (۴)، اس کے علاوہ چیچن کے قدیم آبادی والے علاقے میں عیسائی معابد کے بعض آثار و نقوش کی دست یابی سے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ ان کی پڑوسی عیسائی ریاست جارجیا کے اثر سے بعض چیچنیوں نے عیسائیت قبول کی ہوگی (۵)، تاہم یہ کہنا سخت

(۱) ج ۶، ص ۳۲۔ (۲) نہر تیرک چیچنیا کی مشہور نہروں میں ہے جو قفقاز کے شہروں سے نکل کر نہر خزر (قزوین) میں جا گرتی ہے، اس نہر سے کئی اہم شاخیں پھوٹتی ہیں جن کے نام صونجا، ارگون اور آصا وغیرہ ہیں (ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۷)۔ (۳) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۷۔ (۴) ج ۷، ص ۳۵ ۷۔ (۵) سویت یونین کا زوال، ص ۱۶۹۔

مشکل ہے کہ چیچنیوں کا عام مذہب عیسائیت تھی۔

چیچن اور اسلام

ڈاکٹر فہد العصیمی لکھتے ہیں کہ قبول اسلام سے پہلے چیچن کے قدیم دین و مذہب سے متعلق معلومات بہت کم ملتی ہیں، گو آثار قدیمہ کے بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ وہاں اسلام سے قبل عیسائیت رائج تھی اور شاہ جارجیا داود اور ملکہ تمارا کے زمانے میں چیچنیا میں عیسائیت قبول کرنے پر لوگوں کو مجبور کیا جارہا تھا، اس کے باوجود پوری چیچن قوم اس کے حلقہ بہ گوش نہیں ہوسکی تھی، ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے بہ موجب ابتداً چیچنیوں میں قبول اسلام کی رفتار سست تھی،، اموی حکم راں مروان بن محمد نے جب چیچنیا کی پڑوسی ریاست داغستان فتح کیا اور آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول ۷۳۶-۷۳۸ء میں آرمینیا اور بحر کیسپین کی عربی مہموں کا آغاز کیا تو چیچن شہروں کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا (۱)، اس طرح چیچنیا کے افق پر آٹھویں صدی عیسوی ہی میں اسلام کی کرنیں پڑ چکی تھیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب سولہویں صدی عیسوی میں چیچنیوں کے گلہ بان قبایل پہاڑوں سے اتر کر چیچنیا کے شمالی حصہ میں آباد ہوئے تو وہ مذہباً مسلمان تھے۔

مغل چیچن کشمکش اور چیچن کی اپنے ملک سے محبت

چیچن بہ حیثیت قوم اپنے ملک و وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں ان کے لیے اپنے اوپر غیر قوموں یا غیر ملکیوں کا تسلط ناقابل برداشت ہے، چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب مغلوں نے چیچن علاقوں سے تعرض کیا تو انہیں منہ کی کھانی پڑی، حالاں کہ اسی زمانہ میں مغلوں نے شمالی قفقاز کے استبس کے علاقوں کو مسخر کر کے دو صدی تک وہاں حکومت کی تاہم چیچنیا کے پہاڑی علاقوں پر اپنا تسلط نہ جما سکے (۲) اور ان کی خود مختاری باقی رہی۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوچکا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی ہی میں چیچنیا نور اسلام سے منور ہوچکا تھا اور قبولیت اسلام کی ابتدائی رفتار سست تھی، مگر تیرہویں چودھویں صدی عیسوی میں خانیہ آلتون اردو (کبرد حکم راں) کے زمانہ تک چیچنیائی باشندے اسلام سے مکمل طور پر آشنا ہوچکے تھے، چنانچہ اسی صدی کے نصف آخر کے اختتام یعنی ۱۳۹۱ء-۱۳۹۵ء میں جب تیمور نے

(۱) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۷ تا ۱۰۔ (۲) ایضاً، ص ۱۰-۱۱۔

خانیہ آلتون اردو کی حکومت کا خاتمہ کیا تو اس نے بھی وہاں اسلام کی نشر واشاعت پر زور دیا مگر اس کے مزاج اور طریقہ کار کی سختی کے سبب چیچینیا والوں پر مثبت کے بہ جائے منفی اثرات مرتب ہوئے (۱) اس کے وہاں سے چلے جانے کے بعد خانیہ آلتون اردو اور آذر بائیجان کے مسلمانوں کے اثر سے چیچینیا میں دوبارہ اسلام کو فروغ ہوا (۲) اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں مکمل طور پر اس کا بول بالا ہوگیا جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا سے بھی معلوم ہوتا ہے (ج ۶، ص ۲۲)۔

چیچن پر مسلم کبردوں کا تسلط

چیچینیا میں اسلام کا فروغ و ترقی، مسلمان کبردوں کا بھی رہین منت ہے، تاریخوں میں مذکور ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے قبل چیچینیا کے علاقے پر مسلمان کبرد حکم رانوں کا قبضہ تھا جو بہت پہلے سے کریمیا کے تاتاریوں کے اثر سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوچکے تھے، کبرد دراصل قفقاز کا ایک مسلم گھرانا تھا، جس کا اصلی وطن قفقاز کے مغربی حصہ میں تھا، تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں یہ لوگ دریائے تیرک کے بالائی حصے میں اس وقت آئے جب الان مغلوں کے حملے سے ان کا شیرازۂ اتحاد بکھر گیا اور ان کی قوت کم زور پڑگئی اور یہ دو گروہوں کبردۂ کبیر اور کبردۂ صغیر میں منقسم ہوگئے، کبردۂ کبیر نے دریائے تیرک اور دریائے ملکہ کے مابین سکونت اختیار کی اور کبردۂ صغیر، دریائے سنجہ اور دریائے تیرک کے درمیان آباد ہوئے، آلتون اردو کا تعلق اسی قبیلہ کبرد سے تھا، جس نے اس علاقہ پر اقتدار حاصل کرلیا تھا، آلتون اردو کے بعد بھی کبرد کے لوگوں نے قفقاز کی تاریخ میں نمایاں کام انجام دیے اور سولہویں صدی عیسوی میں ماسکو کے حکم رانوں سے کبرد کے حکم رانوں کے بہتر تعلقات تھے اور سترہویں صدی عیسوی کے آغاز تک یہ سب کے سب نعمت اسلام سے بہرہ ور ہوچکے تھے اور اسی صدی میں قالموق کے خلاف قفقازی باشندوں کے وفاق کی سربراہی کبرد حاکموں نے ہی کی تھی مگر درہ دریال سے قریب ہونے اور ماسکو کی نام نہاد لومڑی دوستی کی بنا پر یہی قبیلہ کبرد کے لوگ روسی اقتدار کے زیر اثر آگئے اور بغیر کسی قابل ذکر مزاحمت کے ان کا تسلط تسلیم کرلیا، البتہ بعض کبرد بالائی کیوبان (Kuban) اور زیلین چک (Zelenchuk) کے درمیان جا بسے اور ۱۸۶۴ء کے بعد کچھ کبرد ہجرت کرکے سلطنت عثمانیہ کے دائرے میں داخل ہوگئے (۳)۔

---

(۱) یعنی حسب منشا اسلام کو فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ (۲) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۸۔ (۳) یہ تفصیلات اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۷، ص ۸۷ تا ۸۹ سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر عصیمی کی تحقیق کے مطابق چیچن شافعی المذہب ہیں اور ان میں تصوف کے سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہے (۱) لیکن اس کے برعکس بعض محققین نے ان کو حنفی مذہب کا پیرو لکھا ہے (۲)۔

چیچینیا زار روس کے شکنجے میں

پندرہویں صدی عیسوی میں واسلی دوم کے بیٹے آئیوان سوم نے باقاعدہ "زار" شہنشاہ کا لقب اختیار کیا، اس کے بعد اس کے لڑکے آئیوان چہارم کے دور اقتدار میں توسیع سلطنت کا دایرہ مزید وسیع ہوا اور اس نے اپنی سرحد سے نکل کر ہم سایہ قوموں اور دوسری مسلم ریاستوں کو اپنی حکومت میں شامل کرنا شروع کردیا، مسلمانوں کے شہر قازان، آستر خان اور تاتار وغیرہ اس کے مقبوضات بن گئے۔

پندرہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں روس کا تسلط کبرد حکم رانوں پر ہوگیا، اس کے بعد اس نے شمالی قفقاز کو زیرنگیں کرنے کے لیے منظم سیاسی کارروائیوں کا آغاز کردیا اور نہر تیرک کے ساحل پر روسی قازقوں کی آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوگیا (۳) اور آئیوان چہارم کے لڑکے فیوڈر اول کے عہد ۱۵۹۸ء میں سائبیریا کی مسلم ریاست زار روس کے قبضہ میں آئی، اس کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک ماسکو طوائف الملوکی کا شکار رہا مگر میخائی رامنوف کے زار منتخب ہونے کے بعد اس کا خاندان مسلسل تین صدی تک برسر اقتدار رہا، اسی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ سے روس کی پہلی جنگ ہوئی جو ۱۶۷۶ء سے ۱۶۸۱ء تک مسلسل ۶ سال جاری رہی، ۱۶۸۷ء سے ۱۶۸۹ء تک کے عرصے میں صرف ریاست تاتار ہی آزاد رہ گئی تھی (۴)۔

چیچن اور روس میں پہلی جنگ

۱۶۸۹ء میں جب پیر اعظم تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو ۱۶۹۶ء و ۱۶۹۸ء میں اس نے یورپی ممالک کا دورہ کیا، واپسی کے بعد اس نے روس کو سائنسی و عسکری لحاظ سے مضبوط کیا اور اس کے نظام میں مزید اصلاحات کیں جس کے سبب لیتویا اور اس کی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے دوسری بالٹک ریاستوں پر بھی اپنا قبضہ جمالیا (۵)، توسیع سلطنت کے

---

(۱) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۸۔ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۷۴۵ و سویت یونین کا زوال، ص ۱۲۹۔ (۳) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۱۱۔ (۴) سویت یونین کا زوال، ص ۲۳۸-۲۳۹۔ (۵) انقلاب روس، ص ۸ و ۹، مطبوعہ الہ آباد، ۱۹۳۶ء و ترکی جمہوریہ کی نشاۃ ثانیہ، ص ۵۵، مطبوعہ برقی پریس، دہلی۔

جذبے سے سرشار ہو کر اس نے چیچن شہروں کو بھی اپنے دائرہ اقتدار میں گرنا چاہا لیکن چیچن قوم روسی قابضوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوگئی (۱)، چنانچہ روس اور چیچنیا کے مقامی باشندوں کے درمیان پہلی جنگ پیٹر اعظم ہی کے عہد میں ہوئی جو ۷ارجولائی ۱۷۳۲ء میں دریائے ارغون پر واقع ''چیچن اول'' کے مقام پر لڑی گئی جس کی قیادت روسی جنرل شہیر گوہ نے کی، ابتدا میں متعدد دفعہ چیچنیا کے جواں مردوں اور جہاد کے متوالوں نے روسی مسلح حملہ آوروں کو پسپا کیا، جن میں بیولاط حاجی میف اور شیخ منصور وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنھوں نے بڑی پامردی سے روسی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر افراد اور سامان جنگ کی قلت کے سبب ان میں نبرد آزمائی کی تاب باقی نہیں رہ گئی اور وہ اپنی شاداب اور ہری بھری زمینوں کو چھوڑ کر پہاڑی علاقوں میں سمٹ گئے، چنانچہ روس نے موقع پا کر وہ علاقے قازقوں میں تقسیم کر دیے (۲)۔

روسی پیش قدمیاں اور چیچن جنگجوؤں کا مقابلہ

چیچنیا کے باشندوں میں شجاعت اور بہادری کے اوصاف نمایاں طور پر موجود تھے، وہ خاموش بیٹھنے والے لوگ نہیں تھے، چنانچہ روسی پیش قدمیوں اور قبضوں کے خلاف صف آرا ہوئے اور منصور اشرمہ کے زیر قیادت دوبارہ ۱۷۸۵ء میں ایک عوامی تحریک برپا ہوئی جسے ۱۷۹۱ء میں بہ زور دبا دیا گیا (۳)، ۱۸۰۱ء میں مشرقی گرجستان پر قبضہ کے بعد روس کے حوصلے مزید بلند ہوئے اور ان کی پیش قدمیوں میں تیزی آئی اور منصوبہ بند طریقے سے روسیوں نے قلعے تعمیر کیے اور روسی قازقوں (Cossacko) کی مزید نوآبادیاں قایم کی گئیں اور مقامی باشندوں کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر کے انہیں بلند پہاڑوں کی جانب ڈھکیل دیا گیا مگر چیچن مسلمانوں نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کے بہ جائے تحریک جاری رکھی اور چیچن مجاہد آزادی غازی محمد متوفی ۱۸۳۲ء کے خاص تربیت یافتہ حمزہ غزوات بیگ نے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور روسی استعمار کو ناکوں چنے چبوا دیے، ۱۸۳۴ء میں حمزہ غزوات بیگ کے انتقال کے بعد سرفروشان آزادی نے شیخ شامل کو اپنا قاید منتخب کیا جو روسی محاذ آرائی کے خلاف ۳۵ سال مسلسل جنگ آزما رہے (۴)۔

(۱) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۱۱۔ (۲) ایضاً (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۷۴۵۔ (۴) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۱۱۔

شیخ شامل اور تحریک جنگ آزادی

شیخ شامل اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں موضع گمری میں پیدا ہوئے، انہوں نے پہلا حملہ خون زاق قلعے پر کیا جو ناکام رہا مگر یہی حملہ شیخ شامل کی شہرت کا سبب بن گیا، چنانچہ ان کے پیش رو حمزہ بیگ کے انتقال کے بعد حریت پسندوں نے ۱۸۳۴ء میں انہیں اپنا قاید منتخب کرلیا، قایدانہ صلاحیت کے باوجود انہوں نے ۱۸۳۷ء میں روس سے شکست کھائی مگر ایک سال بعد داغستان کے ایک بڑے حصے پر قابو پالیا اور اس کے مغرب میں چیچنتزن پر قبضہ کر کے اسلامی حکومت قایم کی، ان کی حکومت میں کل ۳۲ راضلاع تھے اور ہر ضلع میں ان کا ایک خلیفہ (نمایندہ) اور عہدۂ قضا پر مفتی مقرر تھا، اس کے ماتحت چار قاضی ہوتے تھے جن کا انتخاب خود مفتی کرتا تھا، چیچنتزن کا قلعہ ودنو (Wedno) شیخ شامل کی سکونت تھا، شیخ شامل کی تحریک جنگ آزادی اور ان کی حکومت پر قابو پانے کے لیے روس نے ۱۸۴۵ء میں پہاڑی علاقوں میں گھسنے کی تدبیر کی اور جنگلات کی صفائی شروع کی تو قلعہ ودنو میں حریت پسندوں نے سخت مزاحمتیں کیں مگر ۲۵ راگست ۱۸۵۹ء میں شیخ شامل نے قلعہ گونیب (Gunib) میں ہتھیار ڈال دیا اور زار روس الیگزنڈر ثانی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے امام شامل کے ساتھ سلوک کیا اور ان کے اعزہ واقارب کے لیے شہر کالوگا متعین کیا، ۱۸۶۶ء میں انہوں نے زار روس کی وفاداری کا حلف اٹھایا، فروری ۱۸۶۹ء میں حج پر گئے اور مارچ ۱۸۷۱ء میں مدینہ میں وفات پاگئے (۱) لیکن اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ روسی فوجوں کو اپنی تاریخ میں اس سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو ''تحریک مریدین'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے اور جس کے قاید امام شامل تھے، یہ جنگ ۱۸۵۷ء میں اس وقت تک جاری رہی جب امام شامل اور ان کے رفقا حملہ آور فوجوں کا مقابلہ کرتے کرتے جاں بحق ہوگئے (۲)۔

چوں کہ روسی فوجوں کی تعداد کثیر تھی اور وہ جدید آلات جنگ سے مسلح بھی تھیں اور اس کے بالمقابل شیخ شامل کے پاس پرانے روایتی اسلحے تھے اور افرادی قوت بھی روسیوں سے بہت کم تھی، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ شامل کو نہ کہیں سے کوئی امداد ملی اور نہ ہی

(۱) یہ معلومات اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۱، ص ۶۰۷ و ۶۰۸ سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ (۲) سویت یونین کا زوال، ص ۲۳۹۔

عالم اسلام کی طرف سے کوئی تائید وحمایت حاصل ہوئی (۱)، اس لیے ان کی تحریک پوری طرح سے روسی یلغار کے سامنے ٹک نہ سکی، البتہ امام شامل نے اپنے جاں نثاروں اور بعد میں آنے والے سرفروشوں کو یہ پرعزم پیغام ضرور دیا:

"دیکھو! تم اپنی اراضی کبھی نہ چھوڑنا اور اپنا ایمان مت گنوانا، کیوں کہ ایک نہ ایک دن ہمیں آزادی حاصل ہو کے رہے گی، اگرچہ اس وقت میں تم میں موجود نہیں ہوں گا، آج کے بعد مجھے یقین ہے کہ ہمیں میں سے کوئی آگے بڑھ کر علم حریت اٹھائے گا اور تحریک جنگ آزادی کی ذمہ داری سنبھالے گا"۔ (۲)

چیچن باغیوں کا اعلان خودمختاری

شیخ شامل کے بعد چیچن باغیوں نے اپنا مشن جاری رکھا اور روسی قبضہ کے خلاف بای صونقر، اوما دو یف، آطابی اضا ییف، دادہ زالمایف وغیرہ کے نام تحریک جہاد و آزادی کے علم برداروں میں نمایاں ہیں، اس دور کی سب سے بڑی جہادی تحریکات میں علی بیگ حاجی کی تحریک تھی جس کو روس نے گروزنی میں بہ زور ختم کر دیا، مگر چیچن مسلمان سکون سے نہیں بیٹھے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، یہاں تک کہ کمیونسٹ عہد حکومت میں بھی روسی اقتدار کے خلاف لڑتے رہے اور ۱۹۱۷ء میں شمالی قفقاز قبایل کی ایک جمہوریہ قایم ہوئی جس میں چیچنیا کا علاقہ بھی شامل تھا، اس جمہوریہ کی سربراہی حاجی اوزون کے حصہ میں آئی، انہوں نے ۱۱ر مئی ۱۹۱۸ء کو اپنی آزادی و خودمختاری کا اعلان کر دیا تو جنرل ڈانیکن نے ان پر چڑھائی کر کے چیچن علاقوں پر قبضہ کر لیا اور فوجی وعسکری نظام قایم کر کے زار روس کے زمانہ کی یاد تازہ کر دی، اس قبضہ کے خلاف چیچنیا کے تمام قبایل نے متحد ہو کر جنرل ڈانیکن کے فوجی مراکز پر دھاوا بول دیا اور حریت پسندوں نے آزاد جمہوریہ داغستان کی بنیاد رکھ دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کمیونسٹ تحریک زوروں پر تھی اور زار شاہی کا خاتمہ ہو گیا تھا، اس نے آزادی وحریت کے پیغام کی حمایت کی تھی اور اسی کی بہ دولت اس نے اقتدار کی منزلیں طے کی تھیں مگر اس نے بھی مسلمانوں سے غداری اور ان کے خلاف سازش کی اور انہیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے آزاد داغستان پر قبضہ کر لیا اور اس طرح مسلمانوں کی اتحادی قوت ختم ہو گئی

(۱) ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۱۱۔ (۲) ایضاً، ص ۲۱۔

اور روس نے اسی پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور شروع میں بڑے مظالم ڈھائے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۲۱ء کو چیچنیا کو "Gorskaya Republic" میں شامل کیا گیا، ۳۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو بالائی چیچنیا کو خودمختاری حاصل ہوئی، ۷ر جولائی ۱۹۲۴ء کو چیچنیا کے مغرب میں واقع بلاد انگش کو خودمختاری کا پروانہ عطا کیا، ۴ر نومبر ۱۹۲۹ء کو دارالسلطنت گروزنی سے متصل نشیبی علاقوں کو چیچن کے آزاد علاقے میں ضم کر لیا لیکن ۱۹۳۴ء میں دونوں خودمختار علاقوں کو ایک میں ملا کر چیچن انگش خود مختار خطہ بنا دیا اور ۶ر ۱۹۳۶ء میں چیچن انگش کو آزاد سوویت اشتراکی جمہوریہ کی صورت دی گئی (۱)۔

چیچنیوں کی ملک بدری

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب روس اور جاپان میں جنگ ہوئی تو چیچن انگشتیا کے حریت پسند لیڈروں نے سرخ فوج یعنی روس کا ساتھ دیا لیکن اسٹالن حکومت نے عام چیچنیوں پر جاپان کے ساتھ ہمدردی کا الزام لگا کر انہیں ۱۹۴۴ء میں ملک بدری کا حکم دے دیا حتی کہ داغستان میں رہایش پذیر چیچن باشندے بھی اس حکم میں شامل تھے اور ایک اندازے کے مطابق سات لاکھ چیچنیائی مسلمان جلاوطن کیے گئے اور مشرق وسطی ایشیا اور قازقستان میں جبراً بسائے گئے اور ان کی جگہ روسیوں نے دوسرے لوگوں کو لا کر آباد کیا اور ۱۹۴۶ء میں ASSR کی سپریم سوویت کے حکم سے یہ جمہوریہ ہی ختم کر دی گئی اور اس کی جگہ علاقے کو ایک روسی نام دیا گیا، مسلمان چیچنیوں کی تعمیر کردہ مساجد، مدرسے بند کر دیے گئے اور مذہبی و دینی کتابیں نذر آتش کر دی گئیں (۲)۔

چیچنیوں کی وطن واپسی

اس دوران چیچن انگش مسلمان اپنے ملک واپس ہونے کی کوششیں کرتے رہے، اسٹالن کے انتقال کے بعد ۹ر جنوری ۱۹۵۷ء کو سپریم سوویت کے ایک حکم کے مطابق چیچن انگش کو دوبارہ اپنے وطن واپسی کی اجازت مل گئی اور چیچن انگش آزاد سوویت اشتراکی جمہوریہ بحال ہو گئی (۳)، لیکن چیچنیائی مسلمانوں کو مذہبی و دینی احکام کی بجا آوری اور قرآن و حدیث کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار پایا۔

چیچنیائی مسلمان وطن تو واپس ہوئے لیکن ظاہر ہے حالات بدل چکے تھے، ان کی مزروعہ

(۱) لیکن ڈاکٹر فہد العصیمی کی تحقیق کے مطابق ۱۹۳۹ء میں چیچن انگش سوویت اشتراکی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔

(۲) سوویت یونین کا زوال، ص ۱۷۱۔ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۹۴۶ و ماساۃ اخواننا المسلمین، ص ۱۳۔

زمینوں اور رہایشی مکانوں پر غیروں کا قبضہ تھا، یہی وجہ ہے کہ چیچنیا میں روسیوں کی معتد بہ تعداد آج بھی سکونت پذیر ہے، اس صورت حال نے اگرچہ انہیں افسردہ کردیا تھا تاہم وطن سے بے پناہ محبت نے انہیں وہاں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔

چیچنیا کا دوبارہ اعلان خودمختاری

مسلسل تین صدیوں سے چیچنیائی مسلمان اپنی آزادی و حریت کے لیے روسی جارحیت سے نبرد آزما اور ایک لمبی مدت سے اسلام دشمن عناصر کی ناپاک ریشہ دوانیوں کا شکار ہیں، تاہم سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد دوسری مسلم ریاستوں کی طرح چیچنیا نے بھی روسی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا اور ریٹائرڈ جنرل ڈوڈا ایف نے علم بغاوت بلند کیا، انہوں نے یاراگی محمد وف سے مل کر گروزنی میں چیچن عوام اور مقامی سرکاری ملازموں کو اکسایا، ان کی یہ تحریک کامیاب ہوئی اور ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ریاستی صدر اور چیچن پارلیمنٹ کے انتخابات میں ان کی پارٹی چیچن پیپلز متحدہ کانگریس کو فتح حاصل ہوئی اور جعفر ڈوڈا ایف صدر کے عہدہ سے سرفراز ہوئے، صدر ہوتے ہی انہوں نے چیچنیا کی آزادی و خودمختاری کا اعلان کردیا لیکن اس وقت کے روسی فیڈریشن کے صدر بورس یلتسن نے اعلان آزادی مسترد کرکے چیچن انگشتیا میں ایمرجنسی نافذ کردی جب کہ صدر کے اس فیصلہ سے روسی پارلیمنٹ نے اختلاف کیا اور مذاکرات اور پرامن طریقہ سے مسئلہ حل کرنے پر زور دیا، اختلاف کے باوجود روسی صدر نے ۱۹۹۴ء میں چیچنیا کے خلاف جنگی کارروائی کا آغاز کیا، چیچنیا کے موجودہ صدر کی قیادت میں آج بھی اس کی جنگ آزادی جاری ہے(۱)

روس کے موجودہ صدر ولادیمیر پوتین نے سابق صدر یلتسن کے طریقہ پر چیچنیا کی تحریک آزادی کو کچلنے کی پالیسی اپنائی ہے، اخبارات و رسایل کے مطابق چیچنیا کے دارالحکومت گروزنی پر آج بھی روسی فوج قابض ہے لیکن چیچن حریت پسندوں نے روس کے بڑی اور فضائی حملوں کا مقابلہ بڑی پامردی و استقلال سے کیا ہے، خدا کرے اسلامی جمہوریہ چیچنیا روسی شکنجہ سے آزاد ہو اور وہاں ایک پرامن نظام قایم ہو۔

---

(۱) یہ تفصیلات ماسا (اخوان المسلمین اور سوویت یونین کا زوال سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔

٭٭٭٭
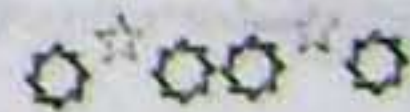
اخبار علمیہ

سعودی عربیہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا جشن منانے کی روایت عرصے سے رائج ہے، اس کی تقریبات تاریخی و تہذیبی حیثیت سے ممتاز شہروں میں منائی جاتی ہیں، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے ریکٹر ڈاکٹر ناصر الصالح نے کہا ہے کہ ۲۰۰۵ء کا جشن مکہ مکرمہ میں منایا جائے گا، مکہ کے گورنر عبدالمجید بن عبدالعزیز نے اس کے پروگرام وضع کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل کی ہے، اس موقع پر مکہ مکرمہ میں ایک اہم علمی مذاکرہ کے انعقاد کی تجویز بھی ہے، اسی طرح مکہ کے بارے میں تصنیف کی گئی مطبوعات و مخطوطات اور اس سے متعلق عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں نو سی ڈی فلموں اور عربی خطاطی کے نمونے کی نمایش کا اہتمام بھی کیا جائے گا، اس جشن کی تیاری کے سلسلے میں مکہ کے متعلق ۱۰۰ کتابیں طبع ہوچکی ہیں جس میں نئی مطبوعات کے علاوہ قدیم مطبوعہ کتابوں کے جدید اڈیشن شامل ہیں، سب سے خوش آیند بات یہ ہے کہ جشن کی تمام سرگرمیوں اور کارروائیوں کی سی ڈی تیار کرکے مختلف مقامی اور غیر مقامی اداروں کو تفویض کی جائے گی، نیز جشن سے متعلقہ تمام کارروائی کی اشاعت کے لیے اس کی اور جامعہ ام القریٰ وغیرہ کی کئی ویب سائٹ تیار کی گئی ہے، جن کو ویب سائٹ پر نشر بھی کیا جائے گا، یہ جشن اگرچہ مکہ میں منعقد ہو رہا ہے اور اسی سے متعلقہ چیزوں کی نمایش مقصود ہے تاہم ڈاکٹر صالح صاحب نے اعلان کیا ہے کہ پوری مملکت اور مختلف ریاستوں علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں کو بھی اس میں حصہ لینے اور شرکت کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ (رابطہ اسلامک نیوز ایجنسی رینا، یکم تا ۱۵/ دسمبر ۲۰۰۴ء)

سعودی حکومت کی وزارت صحت نے حال ہی میں پرائیویٹ طبیہ کالج قایم کرنے کی منظوری دی ہے جو خود کفیل کالج ہوں گے اور اپنے اخراجات کے لیے طلبہ سے فیس وصول کریں گے، سالانہ فیس ایک لاکھ بیس ہزار ریال طے کی گئی ہے اور آیندہ سال ۲۶-۱۴۲۵ھ میں باقاعدہ تعلیم شروع کردی جائے گی، وزارت صحت نے سعودی معالجوں کی شدید کمی کی بنا پر ان کالجوں کو منظوری دی ہے، ابھی تک سعودی یونی ورسٹیوں میں طبی تعلیم کی جانب رجحان بہت کم تھا جس کی

کی مغربی اور پڑوسی ملکوں کے معالجین پوری کرتے تھے اور خود سعودی فارغین زیادہ باصلاحیت اور قابل اعتماد نہیں ہوتے، سعودی وزارت تعلیم کا یہ خیال بھی بجا ہے کہ غیر سرکاری تعلیمی اداروں کی کارکردگی سرکاری تعلیمی اداروں سے بہتر ہوتی ہے، اس لیے پرائیویٹ طبی کالجوں کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا۔

ناسا کے ماحولیاتی سائنس دانوں کی تحقیق ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں بننے والے گھنے اور آلودہ آبی بادل میں زمین کو مرطوب کرنے کی طاقت کم ہوتی ہے، انہوں نے ابتدائی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آلودہ بادل کے بالمقابل صاف بادل میں پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اس تحقیق سے مستقبل میں آب و ہوا اور موسم کے باب میں زیادہ سے زیادہ واقفیت کے امکانات بڑھ گئے ہیں، ان کے خیال میں تہ بہ تہ گھنے اور آلودہ بادل ہوا سے خشک ہو جاتے ہیں اور ان میں پانی کی مقدار اور سورج کی توانائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ اس سے زمین کو مرطوب کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، ان کا کہنا ہے کہ زمین تک پہونچنے والی آفتابی شعاعیں صاف بادلوں کو عبور کر جاتی ہیں جس کے سبب اس تک سورج کی گرمی کم پہونچتی ہے اور وہ ٹھنڈی رہتی ہے، اس کے برعکس چوں کہ گھنے اور آلودہ بادل سورج کی کرنوں کو جذب کر لیتے ہیں، اس لیے زمین گرم رہتی ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ اس تحقیق کی کامیابی سے آب و ہوا اور موسم میں موجود گھنے اور آلودہ بادلوں کے نقصان دہ اثرات سے بچنے کی راہیں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں، اس واقفیت کے لیے ناسا کے خاص "ایرکراف -2" کا استعمال کیا گیا ہے، اس کے علاوہ سائنس دانوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ بھی آلودہ آبی بادلوں میں پانی کی مقدار کی کمی کے اسباب کا پتہ لگایا ہے۔

ماہرین اور سائنس دانوں نے خلا میں بہت دور بگ بینگ سے بھی عظیم دھماکے کا انکشاف کیا ہے، یہ مشاہدہ سائنس دانوں نے ناسا کی "چندرا ایکسرے آبزرویٹری" کے ذریعہ کیا ہے، ان کے بیان کے مطابق سورج جیسے تیس کروڑ سیارے ایک ساتھ چمکے اور انتہائی گھٹاٹوپ اندھیرے میں سما گئے، خلا کے جس حصے میں یہ سانحہ عظیم برپا ہوا اس کا نام MS 0735.6+7421 ہے، اس زوردار دھماکہ سے نکلنے والی برقی توانائی کئی لاکھ گاما ریزوں کے دھماکہ سے پیدا ہونے والی برقی توانائی کے برابر ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم خیال سائنس دانوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس عظیم ترین دھماکے کا سبب اتنی عظیم توانائی کا پیدا ہونا ہے، میکن مارا کا کہنا ہے کہ یہ دھماکہ "مشدوز" کے

علاقے میں ہوا ہے، جس سے خلا کے اس حصے میں "بلیک ہول" کے وجود کا ثبوت ملتا ہے جب کہ ابھی تک چھوٹے چھوٹے بلیک ہول کے وجود کو سائنس داں تسلیم کرتے تھے لیکن اس عظیم ترین دھماکہ کے بعد ہونے والے تیس کروڑ آفتابوں کا کسی انتہائی تاریک اور غیر مرئی حصے میں غایب ہو جانا "عظیم ترین بلیک ہول" کی موجودگی کا ثبوت ہے۔

روزنامہ "الوطن" کویت کی رپورٹ کے مطابق ملیشیا کے بعض جنگلوں کے درخت ایک سو تیس ملین برس پرانے ہیں، اسی وجہ سے اس ملک کا شمار دنیا کے قدیم ترین جنگلوں والے ممالک میں ہوتا ہے، یہاں کے جنگلوں میں متنوع قسم کے اشجار اور نباتات اور ہر طرح کے ذایقے والے فواکہ اور مختلف رنگ و بو کے پھول پائے جاتے ہیں، ملیشیا کی وزارت ثقافت و سیاحت کے خبرنامہ میں بھی اس کو دنیا کا قدیم ترین جنگلوں والا ملک کہا گیا ہے اور محققین کا اندازہ ہے کہ بعض جنگلوں کی عمر ایک کروڑ تیس لاکھ برس ہے، ان گنجان جنگلوں میں پندرہ ہزار قسم کے پھول پائے جاتے ہیں جن میں ملیشیا کا قومی پھول سلحیہ (اورکید) اور دنیا کا سب سے بڑا پھول رافیلزیا وغیرہ قابل ذکر ہیں، موخر الذکر پھول ۹ مہینے میں مکمل طور پر تیار ہوتا ہے، پہلے ان جنگلوں کی لکڑیاں زیب و زینت اور آرایش کے کاموں میں استعمال کی جاتی تھیں مگر اب حکومت نے جنگل کاٹنے پر سخت پابندی عاید کر دی ہے تاکہ ان مایہ فخر اور قدیم تاریخی درختوں کو ختم ہونے سے بچایا جاسکے جو ملک کی آب و ہوا کی خوش گواری و حیات آفرینی کے ضامن ہیں، حکومت نے جنگلات کی نصف آراضی کو باغ بغیچوں اور تفریح گاہوں کی شکل دینے کا بھی بیڑا اٹھایا ہے، ان جنگلوں میں عجیب و غریب قسم کے جانور رہتے ہیں جن کی بولیاں محیر العقول اور حیرت زا ہیں، ۳۳۰۴۳۴ مربع کلومیٹر پھیلے ہوئے ملیشیا کے رقبہ کے چودہ فیصد حصے میں ربڑ اور زیتون کے باغ ہیں، ربڑ کے درختوں سے جوتے، آپریشن میں استعمال ہونے والے دھاگے، دستانے، کھیل کے ساز و سامان وغیرہ بنائے جاتے ہیں، اسی طرح دنیا میں زیتون کے تیل کا سب سے بڑا تاجر ملک ملیشیا ہی ہے، اس ملک میں آم، کیلا، نارنگی، انجیر، ناریل، انناس اور امرود وغیرہ کے باغ بھی کثرت سے ہیں، کاک کے درخت بھی ملیشیا میں پائے جاتے ہیں جن سے چاکلیٹ، کریم اور بعض دیگر اشیا بھی بنائی جاتی ہیں، طبی جڑی بوٹیوں اور عطریات کے پودے اور درخت بھی کثرت سے یہاں اگائے جاتے ہیں۔

ک، ص، اصلاحی

معارف کی ڈاک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خواجہ معین الدین چشتیؒ کا زمانہ ورود ہند

شعبہ اسلامک اسٹڈیز
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
۷/۱/۰۵ء

گرامی قدر مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب، مدیر ''معارف'' اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دسمبر ۲۰۰۴ کا معارف نظر سے گزرا، ڈاکٹر محمد معتصم عباسی آزاد صاحب کا مضمون (حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا زمانۂ ورود ہند۔ تاریخ کے آئینہ میں) خاص طور سے پڑھا، اس لیے کہ تدریسی ضروریات سے آج کل اس موضوع پر مواد کی تلاش تھی، ماشاء اللہ فاضل مضمون نگار نے تاریخی مآخذ کے حوالہ سے بڑی تفصیل سے محققانہ انداز میں اس مختلف فیہ مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور اہم بات یہ کہ نقلی و عقلی دونوں دلایل سے اس مشہور روایت کی عدم صحت ثابت کی ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی راجہ پتھورا (پرتھوی راج) کے عہد میں (یعنی اس علاقہ میں مسلم فتوحات سے قبل) اجمیر میں درود فرما ہوئے تھے، ان کی تحقیق کے مطابق تاریخی اعتبار سے صحیح یہ ہے کہ وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں وارد ہند ہوئے تھے، ہندوستان میں ان کی آمد اور وفات کی تاریخ کے بارے میں مختلف روایتیں مختلف کتابوں میں ملتی ہیں، ڈاکٹر عباسی صاحب نے ان سب کو بڑی خوش اسلوبی سے جمع کر کے ان پر محاکمہ بھی کیا ہے، وہ اس تحقیقی مضمون کے لیے قابل مبارک باد ہیں، اس مسئلہ میں مجھے ذاتی طور پر جو ایک بروقت مدد ملی، میں اس پر اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔

معارف کے اس شمارہ میں علامہ شبلی سمینار پر آپ کا اداریہ اور مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی

صاحب کی مفصل رپورٹ کو بھی بڑی دل چسپی سے پڑھا، آپ حضرات نے اس سمینار کی نسبت سے اس ناچیز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے متعلق بس یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ سمینار کے توسط سے دارالمصنفین کی خدمت کا ایک موقع ملا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، بہر حال آپ لوگوں کی رہنمائی میں اس سمینار کے دوران بہت کچھ سیکھنے و تجربہ حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا، الحمدللہ علی ذالک۔

سمینار کی رپورٹ کی کاپی پروفیسر ریاض الرحمن شروانی صاحب کو دے دیا تھا، وہ کچھ اختصار کے ساتھ اسے ''کانفرنس گزٹ'' کے جنوری کے شمارے میں شایع کر رہے ہیں بلکہ کچھ اور چیزوں کو شامل کر کے انہوں نے اسے علامہ شبلی پر مخصوص شمارہ بنا دیا ہے، سمینار کی نسبت سے یہ خبر بھی (جیسا کہ میں نے فون پر بھی آپ کو بتایا تھا) آپ حضرات کے لیے باعث مسرت ہوگی کہ یہاں شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے ۴ر جنوری کو پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب کے توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا تھا، خطبہ کا موضوع تھا ''مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تعلقات علامہ شبلیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ سے''، یہ پروگرام پروفیسر ریاض الرحمن شروانی صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوا، ظاہر ہے کہ موضوع کی مناسبت سے اس مجلس میں خطبہ کے دوران اور اس سے ماقبل و مابعد بھی استاد و شاگرد کے نام نامی بار بار آئے اور ان کی شخصیت زیر بحث رہی، جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ دونوں حضرات (پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب اور پروفیسر ریاض الرحمن شروانی صاحب) علامہ شبلی سمینار میں مدعو تھے لیکن بعض وجوہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے، اس لیے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی اس علمی مجلس کو علامہ شبلی سمینار کی توسیع شدہ نشست (EXTENDED SESSION) کہا جا سکتا ہے، میں نے اس پروگرام کے آخر میں اپنے تاثرات میں بھی یہی بات کہی تھی حسن اتفاق کہ آج ایک اردو اخبار نے اس پروگرام کی سرخی ''سمینار'' لگائی ہے، امید کہ آپ حضرات بھی اس سے اتفاق کریں گے۔

محترم جناب عبدالمنان ہلالی صاحب اور دیگر متعلقین کی خدمت میں میرا سلام، بس عاؤں میں یاد رکھیں گے۔

والسلام
محتاج دعا
ظفر الاسلام اصلاحی

وفیات

علی جوادزیدی کی رحلت

افسوس ہے کہ ۶؍دسمبر ۲۰۰۴ء کو جناب سید علی جوادزیدی لکھنؤ میں رحلت فرما گئے، ان کی وفات علمی وادبی دنیا کا سخت حادثہ ہے، ان سے راقم کا ذاتی تعلق تھا اور وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں اور اس کے نہایت مخلص خیرخواہ تھے، مرحوم تقریباً نوے برس کے ہوگئے تھے، عرصے سے بیمار تھے، کئی بار قلبی دورہ بھی پڑچکا تھا لیکن اس پیری اور بیماری میں بھی ان کے ولولے اور حوصلے جوانوں کی طرح بلند تھے، کتنے ارمان اور کیسے کیسے علمی وادبی منصوبے ان کے ذہن میں پرورش پاتے رہتے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی تو ان کا ذکر دل چسپی سے کرتے تھے، اب شمع علم کے ایسے پروانے، تلاش، تحقیق اور جستجو کے دیوانے اور شعر وادب کے متوالے، فضل وکمال کی تحصیل میں سرگرداں اور تحریر وتقریر میں کامل الفن کہاں ملیں گے جن کو اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور ہندی پر عبور اور سنسکرت سے واقفیت ہو اور وہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کا دل کش نمونہ، قوم ووطن کی محبت میں سرشار اور اپنی مذہبی واخلاقی قدروں کے پاسباں ہوں، دراصل وہ سانچا ہی ٹوٹ گیا جس میں علی جواد جیسے ذہین وطباع، صائب الرائے، معاملہ فہم، عظمت وشرافت کے حامل، مہر ومحبت کے پتلے، حلم ومروت کے پیکر اور وضع داری، رکھ رکھاؤ اور انکسار کے مجسمے ڈھلا کرتے تھے۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی   پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

علی جوادزیدی شاعر، ادیب، محقق، نقاد، خاکہ نگار، صحافی، عالم، دانش ور، سیاست داں، مجاہد آزادی، فرض شناس اور ایمان دار افسر اور مختلف علوم وفنون میں دست گاہ رکھتے تھے، فلسفہ، تاریخ، اقتصادیات، سماجیات، لسانیات، ادبیات اور اسلامیات ہر میدان ان کی جولان گاہ تھا اور وہ گوناگوں اوصاف کے حامل، پروقار اور دل آویز شخصیت کے مالک تھے، ان کی سیرت کے جلوے گوناگوں اور رنگارنگ تھے، وہ پاک دل، پاک باز، خوش طبع، خوش اطوار، نیک طینت، نیک نہاد، متواضع، خلیق، شریف النفس، دردمند، محب وطن اور انسان دوست تھے، افسوس ہے کہ

متانت، شایستگی، دل داری اور دل نوازی کا یہ پیکر ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نمایاں ہوتا ہے

وہ ۵؍جمادی الاولیٰ - ۱۶؍مارچ ۱۹۱۶ء کو اپنے ننھیال کرہاں میں پیدا ہوئے تھے جوان کے ددھیال محمد آباد گوہنہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا، یہ دونوں بستیاں پہلے اعظم گڈھ میں اور اب ضلع مئو میں شامل ہیں، محمد آباد سنی اور شیعہ شرفا کی قدیم آبادی ہے، زیدی صاحب کے ننھیال اور ددھیال کا تعلق سادات کے زمین دار گھرانے سے تھا، ان کا خاندان شرقی سلاطین کے زمانے میں جون پور میں آباد ہوا، اسے جون پور اور اعظم گڈھ کی سرحد پر واقع بجولی کے نواح میں ۲۲ گاؤں جاگیر میں ملے تھے، زیدی صاحب کے مورث اعلا حضرت سید کمال صاحب کشف بزرگ تھے، یہ جون پور میں قضا کے منصب پر فائز تھے مگر دنیا سے طبیعت اچاٹ ہوگئی تو بجولی میں اقامت اختیار کرلی اور عبادت وریاضت میں اپنی زندگی گزاردی، ان کی وفات کے بعد خاندان کے لوگ بجولی کے قریب اعظم گڈھ کے موضع کیدلی پور میں آباد ہوگئے لیکن زیدی صاحب کے جد اعلا سید عبدالعلی صاحب کیدلی سے محمد آباد گہنہ چلے آئے، کچھ عرصے بعد ننھیال کے مورث اعلا میر شمس الدین عرف میر مسی محمد آباد چھوڑ کر کرہاں کے جنگل میں سکونت اختیار کرکے رشد وہدایت میں مصروف ہوئے۔

زیدی صاحب کے خاندان کو شریعت وطریقت میں مرجعیت کے علاوہ علمی اور دنیاوی وجاہت بھی حاصل تھی، شعر وشاعری کا ذوق اور علم وفن سے وابستگی کئی پشتوں سے چلی آرہی تھی، ننھیال اور ددھیال دونوں جگہ کے لوگوں کے پاس ذاتی کتب خانے تھے، مذہبی تقریبات، میلاد کے جلسے، مجلسیں، مقاصدے، مسالمے اور مشاعرے برابر ہوتے تھے، جن میں یہ بھی شریک ہوتے، اسی وجہ سے زیدی صاحب کو بچپن ہی سے شعر وسخن کا ذوق، علم وادب سے شغف اور مطالعے کا چسکا لگ گیا تھا، ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، مولوی سید محمد تقی صاحب سے فارسی کتابوں آمدنامہ، گلزار دبستاں، کریما، گلستاں بوستاں اور دیوان حافظ وغیرہ کا درس لیا اور عربی نحو وصرف میں میزان، منشعب، صرف ونحو میر، پنج گنج، ہدایۃ النحو، کافیہ، صغریٰ، کبریٰ اور دینیات بھی ان ہی سے پڑھیں، ان کے والد تجارت کرتے تھے، اسی لیے ریاضی اور ہندی بھی اسی زمانے میں سیکھ لی تھی۔

باقاعدہ عربی پڑھنے کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا لیکن ابھی یہ ۱۳ برس ہی کے تھے کہ والد بزرگوار سید علی امجاد افسر کا انتقال ہوگیا تو ان کے ایک عزیز حاجی سید علی جواد مرحوم انہیں ریاست محمود آباد (سیتاپور) جہاں وہ برسر منصب تھے لے آئے اور ۱۹۳۰ء میں کالون اسکول میں اخل کردیا جہاں سے ۱۹۳۵ء میں ہائی اسکول پاس کیا، ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج لکھنؤ سے انٹر کیا، پھر لکھنؤ یونی ورسٹی سے ۱۹۳۹ء میں بی اے اور ۱۹۴۲ء میں ایل ایل بی کی ڈگری لی۔

لکھنؤ آکر پہلے تو وہ طلبہ سیاست میں الجھے پھر ملک کی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیا، ان کی شاعری کا آغاز وطن ہی میں ہوگیا تھا، شیخ ابوالحسن جرم محمد آبادی سے جو آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے، زیدی صاحب کو شعری اسقام اور محاسن شعری کا علم ہوا، گیارہ برس کی عمر میں ان کے ماموں سید محمد رسا کو ان کے بعض اشعار سن کر بڑی حیرت ہوئی، اس لیے علی میاں کامل محمد آبادی کی غزل کا یہ مصرع طبع آزمائی کے لیے دیا تا کہ ان کا امتحان ہوجائے ع شامیانہ بن گیا جب سر پہ چادر تان لی

زیدی صاحب نے چار پانچ شعر کہہ کر پیش کیا جن میں یہ شعر پسند کیا گیا:

بے مرے بازار کی داد وستد کچھ اور ہی جان دی اس پر ہمیشہ جس نے اپنی جان لی

۱۲ رسال کی عمر میں ایک نعتیہ قصیدہ کہا اور والد اور چچا کی موجودگی میں مقاصدہ میں اسے برسرمنبر پڑھا جس پر ان کو خوب داد ملی مگر چچا نے ناگواری ظاہر کی اور کہا کہ شعر وشاعری کے چکر میں پڑکر برباد ہوجائیں گے، یہ قصیدہ اس وقت ہفت روزہ المصطفی جون پور میں شایع بھی ہوا۔

محمود آباد آئے تو گھر کی پابندیاں ختم ہوگئی تھیں اور یہاں شعری و ادبی سرگرمیوں کے لیے اور وسیع میدان مل گیا تھا، علمی و ادبی حلقوں سے شناسائی ہونے لگی، یہاں سے لکھنؤ بھی آنا جانا ہوتا تھا، وہاں کے اہل علم اور کبار شعرا سے ملاقات اور استفادہ کرتے، گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج میں داخلہ لیا تو شعر وادب سے شغف دیکھ کر انہیں کالج کی انجمن اب اردو کا سکریٹری بنایا گیا، انجمن کے مشاعروں میں انعام حاصل کیا اور مشاعروں کی تاریخی اہمیت پر مضمون لکھا جو نیرنگ خیال لاہور میں چھپا، اس سے بڑا حوصلہ ملا، اب ان کے جراید ورسایل کے اڈیٹروں سے بھی تعلقات ہوگئے، منشی دیانراین نگم کے مشہور رسالہ زمانہ کان پور میں مضامین لکھے جن کا معاوضہ ملا، منشی جی نے انہیں ہونہار دیکھ کر کان پور سے بی-اے کرنے اور اپنے اخبار ''آزاد''

میں معاونت کرنے کی دعوت دی جس کو زیدی صاحب نے منظور کرلیا، یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، بی-اے میں داخلہ بھی لے چکے تھے مگر لکھنؤ جیسا علمی وادبی ماحول نہیں تھا، اس لیے ان کا جی نہیں لگا اور وہ لکھنؤ آکر بی-اے کرنے لگے۔

اس وقت لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کا بڑا زور تھا اور لکھنؤ یونی ورسٹی میں خاص طور پر اس کا غلغلہ بلند تھا، ''نیا ادب'' اس تحریک کا ترجمان تھا، علی جواد زیدی بھی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے رکن ہوگئے، ان کے احباب نے ان کے احتجاج کے باوجود انہیں لکھنؤ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر چن لیا، پھر آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری اور ۱۹۴۱ء کے پٹنہ اجلاس میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری منتخب کرلیے گئے، اس وقت دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور نوجوانوں اور طالب علموں کو گرفتار کیا جارہا تھا، جنگ کی ابتدا میں تمام سیاسی پارٹیاں اسے سامراجی جنگ تسلیم کرکے اس کے خلاف آواز بلند کررہی تھیں، ہر طرف جلسے جلوس، نعرے اور پرجوش نظمیں اور تقریریں ہورہی تھیں کہ اب برطانوی سامراج کی ریڑھ کی ہڈی توڑنے اور اس پر آخری وار کرنے کا وقت آگیا ہے، اتفاق سے اسی زمانے میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے کسی شعبے کا افتتاح کرنے کے لیے ہندوستان کی فیڈرل کورٹ (سپریم کورٹ) کے چیف جسٹس اور دلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر آئے، ان کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا، اس میں اور اس وقت کی ہر سیاسی سرگرمی میں زیدی صاحب، علی سردار جعفری اور جلیل عباسی مرحوم پیش پیش ہوتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کے خلاف وارنٹ جاری ہوا مگر طلبہ کے ہیجان اور دلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی بدنامی کے باعث گرفتاری رک گئی مگر کچھ ہی عرصے بعد ان کی قیادت میں طلبہ کی زبردست اسٹرائیک اور جلسہ عام ہوا، اس دفعہ پھر ان کے خلاف وارنٹ جاری ہوا مگر طے پایا کہ طلبہ کی سالانہ کانفرنس تک جو ناگ پور میں ہونے والی تھی، یہ گرفتاری دینے سے بچیں چنانچہ ادھر اُدھر چھپتے پھرے، اسی زمانے میں ان کی شادی ہونے والی تھی مگر اسے ملتوی کرادیا اور ناگ پور کانفرنس میں شریک ہوئے اور برطانوی سامراج کے خلاف لہک لہک کر نظمیں پڑھیں، آخر گرفتار کرکے لکھنؤ لائے گئے، مجسٹریٹ ان کے چچا کا دوست تھا، اس کے اصرار کے باوجود یہ مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے اور عدالت میں بیان دیا کہ وہ برطانوی عدالت

کوتسلیم نہیں کرتے، ان کے انکار پر انہیں چھ ماہ کی سزا ہوئی اور لکھنؤ سے بنارس سنٹرل جیل بھیج دیے گئے جہاں سردار جعفری اور مرحوم جلیل عباسی پہلے سے موجود تھے، جیل جانے سے ان کا یہ تعلیمی سال ضایع گیا اور ۱۹۴۲ء میں لا کر سکے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد جرمنی نے روس پر جب حملہ کردیا تو کمیونسٹوں نے جنگ کو سامراجی ماننے سے انکار کردیا اور اسے عوامی کہنا شروع کیا، یہیں سے ان کے اور غیر کمیونسٹ لوگوں کے راستے الگ الگ ہوگئے، اس کی وجہ سے اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھی دو حصوں میں بٹ گیا، علی جواد زیدی صاحب سوشلسٹ اور قوم پرور گروہ کے سکریٹری تھے جس کے اکثر ارکان گرفتار ہو چکے تھے مگر انہوں نے گرفتاری سے بچنے کی حکمت عملی اختیار کی اور پورے ملک کا خفیہ دورہ کیا، ۱۹۴۵ء میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن اسٹوڈنٹس کانگریس کے نام سے موسوم ہوئی، اب زیدی صاحب طالب علم نہیں رہے اس لیے طلبہ سیاست سے علاحدہ ہوگئے، چنانچہ ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی، سزایافتہ ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی تھی، اپنے وطن اعظم گڈھ میں اس وقت کے نامور وکیل اور مشہور قومی شاعر اقبال سہیل مرحوم کی رہنمائی میں وکالت شروع کی، کامیابی نہیں ملی تو غازی پور میں پریکٹس شروع کی، یہاں وکالت تو چلی مگر ادبی وسیاسی ماحول نہ ہونے کی وجہ سے ان کا جی نہیں لگ رہا تھا، اب ملک آزاد ہو چکا تھا، ایک روز غازی پور میں ان کے دوست اور کانگریسی لیڈر کیشو دیو مالویہ ملے جو اس وقت پارلیمنٹری سکریٹری تھے، وہ اپنے ساتھ زیدی صاحب کو لکھنؤ لائے، چند ماہ بعد اترپردیش حکومت نے انہیں اردو جرنلسٹ سکشن کا آفیسر انچارج مقرر کردیا اور وہ محکمہ اطلاعات سے منسلک ہوگئے، ان کو صحافت کا اچھا تجربہ پہلے سے تھا، ملک کے اکثر اخباروں اور رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے لکھنؤ کے کئی اخباروں اور بعض انگریزی اخباروں میں کام بھی کر چکے تھے، ان کے یہی تجربے اس ملازمت کے باعث بنے اور ترقی کر کے پبلی کیشنز آفیسر، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدوں پر فائز ہوئے۔

یہاں ان کی ادارت میں "اطلاعات" نکلا جس میں صرف پریس نوٹ چھپتے تھے، اسے انہوں نے "نیا دور" کا نام دے کر ایک معتبر ادبی رسالہ بنا دیا، جنوری ۱۹۵۶ء میں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے یونین پبلک سروس کمیشن کے لیے منتخب ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں ڈیپوٹیشن پر ریاست جموں و کشمیر

چلے گئے اور اس وقت کے وزیر اعلا کشمیر بخشی غلام محمد کے پی آر او ہوئے، ان کی کوششوں اور بخشی غلام محمد صاحب کی دل چسپی سے یہاں اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز کا قیام عمل میں آیا جس سے انہوں نے ایک اچھا ادبی رسالہ "شیرازہ" نکالا، کشمیر میں قیام کے زمانے میں وہ اس کی اکثر ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں دخیل رہے اور خود بھی گوناگوں مفید اور اہم علمی وتحقیقی کام انجام دیے۔

۱۹۶۲ء میں پھر وہ دلی آگئے اور ۱۹۶۷ء میں ڈھائی برس کے لیے بمبئی میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر برائے مہاراشٹرا، گجرات وگوا رہے، پھر دلی آکر ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل نیوز آل انڈیا ریڈیو ہوئے، اسی زمانے میں گجرال کمیٹی کے ممبر جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔

جون ۱۹۷۵ء سے جولائی ۱۹۷۸ء تک وہ آل انڈیا ریڈیو کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے مغربی ایشیا میں رہے، ان کا ہیڈ کوارٹر تہران تھا مگر افغانستان، کویت، بحرین، عمان، قطر، شارجہ، دوبئی، ابوظبی، لبنان، سعودی عربیہ اور یمن بھی جانا ہوا، اس سے پہلے حکومت ہند کے ایک وفد کے ساتھ بھی افغانستان گئے تھے، طالب علمی کے زمانے میں جزائر انڈمان ونکوبار اور جزائر لکشادیپ کا دورہ کیا تھا، ۱۹۷۰ء میں امریکہ، فرانس، انگلستان، کناڈا، جاپان، ہانگ کانگ اور سنگاپور جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

۱۹۷۸ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور ۱۹۸۱ء میں اترپردیش اردو اکادمی کے صدر منتخب کیے گئے، ان کے دور میں اکادمی نے ترقی کی اور مختلف نئے کام انجام پائے، دوماہی "اکادمی" کا اجرا ہوا، اس کے بعد وہ لکھنؤ ہی میں رہ کر خاموشی اور یک سوئی سے علمی وتحقیقی مشاغل میں مصروف رہے لیکن ۱۹۹۱ء میں بمبئی مستقل قیام کے ارادے سے گئے اور زینبیہ انسٹی ٹیوٹ کے دوماہی رسالے "العلم" کے اعزازی مدیر رہے، ۱۹۹۵ء میں پھر لکھنؤ آکر گومتی نگر میں اپنے ذاتی مکان میں مستقل رہائش اختیار کی اور بالآخر لکھنؤ کی خاک کا پیوند ہوگئے۔

علی جواد زیدی کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں جن کا سلسلہ طالب علمی ہی کے زمانے میں شروع ہوگیا تھا اور آخر آخر تک جاری رہا، حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے جھمیلوں میں رہتے ہوئے انہوں نے کس طرح یہ بیش بہا سرمایہ تیار کرنے کے لیے وقت نکالا،

تصانیف کے علاوہ وہ ملک کے اکثر موقر رسایل و جراید میں برابر علمی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہتے تھے اور کئی رسالوں کی ادارت بھی کی بلکہ بعض کے بانی مدیر بھی تھے، ان کی تصانیف و مقالات کے موضوعات بھی نہایت متنوع اور گوناگوں ہیں، ان کا شمار ملک کے صف اول کے اردو اہل قلم اور بلند پایہ شعرا میں ہوتا ہے، انہیں نظم و غزل پر یکساں قدرت تھی، حسب ذیل شعری مجموعے چھپ گئے ہیں۔

۱- رگ سنگ، ۲- میری غزلیں، ۳- دیار سحر، ۴- انتخاب علی جواد زیدی، ۵- نسیم دشت آرزو، ۶- تیشۂ آواز، ۷- سلسلہ۔

علمی و ادبی تحقیق کے موضوع پر یہ کتابیں شایع ہوئی ہیں:

۴- ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ۵- قصیدہ نگاران اتر پردیش، ۶- مثنوی نگاری، ۷و۸- دہلی مرثیہ گو جلد اول و دوم، ۹- میر انیس، ۱۰- تاریخ مشاعرہ۔

مطبوعہ تنقیدی کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۱- تعمیری ادب، ۱۲- تاریخ ادب اردو کی تدوین، ۱۳- دو ادبی اسکول، ۱۴- فکر و ریاض، ۱۵- کمال ابوالکلام۔

جو کتابیں مرتب و مدون کر کے شایع کی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۶- پیام آزادی، ۱۷- نغمۂ آزادی، ۱۸- اردو میں قومی شاعری کے سو سال، (۱۸۵۷ سے ۱۹۵۷ء تک) ۱۹- انوار ابوالکلام، ۲۰- دیوان غنی کاشمیری، ۲۱- انیس کے سلام، ۲۲- انتخاب رند، ۲۳- سرود ہم سایہ، ۲۴- رباعیات انیس، ۲۵- مالک رام ایک مطالعہ۔

خاکہ نگاری میں دو کتابیں چھپی ہیں: ۲۶- آپ سے ملیے، ۲۷- ہم قبیلہ۔

ہندی میں: ۲۸- نغمۂ آزادی اور ۲۹- غالب ایک پریچے اور انگریزی میں دس کتابیں لکھیں۔

مطبوعہ کے علاوہ متعدد کتابیں ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں جن میں بعض غالباً نامکمل ہیں، اردو میں رام کتھا اور یادوں کی رہ گزر کو مکمل کر چکے تھے، اردو اور انگریزی میں جو مضامین لکھے ہیں وہ کئی جلدوں میں آئیں گے، دو تین برس قبل جناب سبط محمد نقوی نے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شایع کیا تھا، ان کی کتابوں اور مقالات سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو ہمیشہ فیض پہنچتا رہے گا۔

زیدی صاحب کی کتابوں کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی، ان پر مرکزی اور بعض ریاستی حکومتوں اور اردو اکیڈمیوں اور اداروں نے انہیں ایوارڈ سے نوازا، اتر پردیش کے سابق وزیر اعلا ہیم وتی نندن بہوگنا نے ۱۹۷۲ء میں ان کو تامرا پتر اسے نوازا اور حکومت ہند نے پدم شری کا خطاب دیا۔

ان کے قدر دانوں نے ایک بار انہیں ایک یادگار صحیفہ نذر کرنے کے لیے ایک تہنیتی کمیٹی بنائی، جب ان سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے ان قومی نظموں کا انتخاب شایع کرنے کا مشورہ دیا جنہیں برطانوی حکومت نے ضبط کر لیا تھا، چنانچہ "ضبط شدہ نظمیں" کے نام سے کتاب شایع کی گئی جسے اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنے ہاتھوں سے زیدی صاحب کو دیا۔

علی جواد زیدی کا حلقہ تعارف بڑا وسیع تھا، ملک کے ہر طبقہ و مسلک اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان میں اصحاب علم و فضل ہی نہیں تھے بلکہ مشاہیر ارباب سیاست، قومی رہنما اور وزرا اور اعلا حکام بھی تھے، ان کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جانے اور چیدہ لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے، وہ جہاں جاتے اپنی خوش طبعی، شرافت اور دل نوازی کا نقش چھوڑ جاتے اور سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے، ان کے تعلقات کا دایرہ چوٹی کے لوگوں یا بزرگوں اور ہم سروں ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ خوردوں اور کم تر درجے کے لوگوں سے بھی بڑی گرم جوشی سے ملتے، ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے اور ان سے اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں مدد لیتے، اعظم گڈھ ان کا وطن اور لکھنؤ وطن ثانی تھا، دونوں جگہوں کے اکثر قابل ذکر لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، "یادوں کی رہ گزر" سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر و ادیب ہو جس سے افادہ و استفادہ کا تعلق نہ رہا ہو، مولانا سبیل سے وکالت میں تلمذ کا شرف حاصل ہوا تو انہیں برابر یاد رکھا، ان پر مضمون لکھا جو ان کی کتاب "آپ سے ملیے" میں شامل ہے، "قومی شاعری کے سو سال" میں ان کی اور یحییٰ اعظمی مرحوم کی نظمیں شامل کیں۔

دارالمصنفین سے قلبی تعلق تھا، اعظم گڈھ میں قیام کے زمانے میں یہاں برابر آتے، کتب خانے کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندویؒ سے خاص طور پر استفادہ کرتے، ان کی کتابوں کے حوالے اپنی کتابوں میں دیے ہیں، شبلی ڈے کے موقع پر تقریریں کرتے، شاہ معین الدین احمد ندویؒ اور سید

صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سے بڑے مخلصانہ روابط تھے، اپنے وطن محمد آباد آتے تو یہاں ضرور تشریف لاتے اور عموماً ایک روز و شب دارالمصنفین میں قیام بھی کرتے۔

جناب صباح الدین صاحب بھی لکھنؤ جاتے تو ان سے ضرور ملاقات کرتے، میرا بھی یہ معمول بن گیا تھا، زیدی صاحب کہتے تھے کہ میں تو جب بھی محمد آباد جاتا تھا تو میرے لیے دارالمصنفین کی حاضری لازمی ہوتی تھی، میں نے عرض کیا کہ میں بھی لکھنؤ آکر آپ سے نہیں ملتا تو بڑی خلش رہتی ہے، زیدی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور علم متحضر تھا، ان کی گفتگو علمی اور پر از معلومات مگر بہت دل چسپ ہوتی، اسے سن کر بہت سی گرہیں کھل جاتیں، وہ مجھ جیسے حقیر کا بڑا اعزاز کرتے اور دوسروں سے اتنا شان دار تعارف کراتے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا، جس زمانے میں وہ اکادمی کے صدر تھے، میں ان سے ملنے ہلبر اہاؤس گیا تو انہیں مطالعہ میں مستغرق پایا، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، میں نے کہا میری وجہ سے آپ کا سارا انہماک ختم ہو گیا، اسی اثنا میں ڈاکٹر محمود الہی آگئے، وہ اس وقت اکادمی کے چیر مین تھے، زیدی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرانا چاہا تو انہوں نے کہا، آپ ان کا تعارف مجھ سے کرائیں گے یا میں آپ سے ان کا تعارف کراؤں گا۔

وہ بہت کھلے اور روشن دماغ شخص تھے، ہمیشہ نیشنلسٹ اور سیکولر رہے لیکن عقیدتاً پکے مسلمان اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے، البتہ فرسودہ رسوم وظواہر، تعصب اور کورانہ تقلید کے خلاف تھے، رواداری اور انسان دوستی کی بنا پر ہر مذہب وملت کا احترام کرتے تھے، فرقہ وارانہ جھگڑوں سے نفرت تھی، اختلاف اور الجھاؤ کی باتوں سے دور رہتے، ہر فرقہ و جماعت کے لوگوں سے تعلق رکھتے، ان کی زبان سے کبھی نفرت اور تعصب کی بات سننے میں نہ آتی، ہندو مسلم اختلافات، شیعہ سنی جھگڑوں اور اردو کے مسایل کو وہ وسیع پس منظر میں دیکھتے تھے، جذباتی اور سطحی باتیں کرنے کے بجائے ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہوتا تھا۔

اپنی رواداری اور بے تعصبی کی بنا پر اردو رام کتھاؤں پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، دو تین برس پہلے ایک روز فون کیا کہ رام لعل نابھوی کے اردو فارسی رامائنوں پر جو مضامین معارف میں شایع ہوئے تھے، اس کے کچھ شمارے میرے پاس محفوظ نہیں، انہیں جلد بھیج دو، میں نے کہا میں نیا دور میں "یادوں کی رہ گزر" بہت شوق اور دل چسپی سے پڑھ رہا ہوں مگر یہ تو بتایئے کہ کیا لکھنؤ

ہی کی یادوں کا ذکر ہوگا یا اس کے باہر کی بھی یادیں قلم بند ہوں گی، کہنے لگے ہاں ایک صاحب نے اور شکایت کی کہ ع کہی حکایت ہستی تو درمیاں سے کہی - اسے ابتدا تا انتہا پہنچانے کا ارادہ ہے۔

میں ان سے بے تکلف ہو گیا تھا، صباح الدین صاحب کے انتقال سے پہلے یا بعد میں ایک دفعہ وہ دارالمصنفین آئے، کھانے پر وہی اور میں تھا، میں نے کہا اعتراضاً نہیں بلکہ اپنی واقفیت کے لیے دریافت کر رہا ہوں کہ کیا اہل تشیع کے یہاں قرآن مجید چالیس پاروں میں تھا، انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ ما بین الدفتین جو ہے وہی قرآن مجید ہے، میں نے کہا مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سورۂ قیامہ کی تفسیر میں جمع قرآن پر بحث کرتے ہوئے محققین علمائے شیعہ کا یہی خیال بتایا ہے، پاروں اور رکوع کی تقسیم تو عجمیوں نے کی ہے، قرآن مجید تو اصلاً سورتوں اور آیتوں میں منقسم ہے، اگر اس کا کچھ حصہ ضایع ہو جاتا تو یہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت قرآنی کے وعدے کے خلاف ہوتا، میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ کیا متاخرین علمائے شیعہ میں کسی نے یہ بات لکھی ہے، انہوں نے کہا میرے علم میں نہیں۔

وہ بہت اصول پسند تھے، ان کے اوقات بہت منضبط تھے، وہ دفتری اوقات میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، دفتر میں شعر وادب پر بھی بحث و گفتگو نہ کرتے اگر کوئی عزیز آجاتا یا شاعر آکر کچھ سنانا چاہتا تو اسے روک دیتے اور معذرت کر لیتے، زیدی صاحب میں بڑی خودداری تھی، خوشامد اور تملق کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے تعلقات وزرا اور اعلا عہدہ داروں سے تھے لیکن ملازمت میں آنے کے بعد وہ ان سے ملنے سے احتراز کرتے تھے، چاہتے تو اپنے لڑکوں اور عزیزوں کو اچھی اور بڑی ملازمتیں دلا سکتے تھے، سروجنی نائیڈو سے ان کی اچھی شناسائی تھی اور وہ ان کی شاعری کو بہت پسند کرتی تھیں، جب یو پی کی گورنر ہو کر آئیں تو اپنی بے نیازی اور غرضی کی وجہ سے ان سے ملنے کے روادار نہیں ہوئے، ایک روز گورنر صاحبہ نے خود انہیں چائے پر بلایا تب ہی گئے اور ملاقات کی لیکن اس میں غرور اور گھمنڈ کو دخل نہ تھا، اپنی علمی برتری اور دنیاوی وجاہت کے باوجود ان میں فخر وغرور کا کوئی شایبہ نہ تھا، ان کے جیسی بے نفسی اور فروتنی مجھے بہت کم لوگوں میں نظر آئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

ضمائر القرآن: از ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی مرحوم، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۵۶۰، قیمت: ۳۰۰/روپے، پتہ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ ڈی ۳۴ر، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی -۲۵۔

قرآن مجید کی عبارت واسلوب اور الفاظ ومعانی میں غور وفکر کا مبارک سلسلہ قیامت تک جاری رہنے والا ہے، اس بحر بے کراں کی غواصی میں علم وحکمت کے موتیوں کا ہاتھ آنا یقینی ہے، یہ کتاب بھی ایسی ہی کامیاب کوشش ہے جس میں بعض آیات میں ضمیروں کے مراجع پر بحث کی گئی ہے، مفسرین کے نزدیک یہ موضوع ہمیشہ مہتم بالشان رہا کہ مرجع کی تلاش بامعان نظر ہی ممکن ہے، ایک ہی بات بلکہ جز وآیت کے اندر ایک ہی خبر کے مرجع کا علم، قرآن مجید کے بے مثال اسلوب بلاغت کے بلند ترین معیار کے مطابق آسان نہیں رہتا، تعیین ضمائر میں مستقل کتابوں کا ذکر علوم القرآن کے وسیع ترین ذخیرے میں ملتا ضرور ہے لیکن اردو میں خاص طور پر ایسی کتابیں کم ہیں، اس کتاب کے مولف مرحوم قرآنیات سے ذوق وشغف کی نعمت سے بہرہ ور تھے، کئی مضامین ان کے قلم سے نکلے اور آخر عمر میں تو ان کی ساری توجہ مطالعہ قرآن ہی پر مرکوز رہی، یہ کتاب بھی اس مطالعہ کا نتیجہ ہے، انہوں نے ایسی آیات کا انتخاب کیا جن کی ضمیروں کے مرجع میں اقوال مختلف ہیں اور جن کی ترجیحی حیثیت کا ادراک آسان نہیں لیکن مختلف اور مستند تفسیروں کی روشنی میں انہوں نے اقوال کی ترجیح کی کوشش کی اور آیتوں کی آسان اور مختصر تشریح بھی کردی، توضیح، ملحوظہ، یادداشت، تنبیہ، انتباہ کے عنوانوں کے تحت ان کا حاصل مطالعہ قدر کے لائق ہے اور قرآنیات کے طالب علموں کے لیے یہ خاص طور پر دل چسپ اور بہت مفید ہے، مولف مرحوم کے لائق اور خود صاحب علم فرزند جناب عمر خالدی قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس مفید کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا، زیر نظر اڈیشن سے پہلے بھی اس کی طباعت ہوچکی تھی لیکن اغلاط کی کثرت سے انہوں نے طبع اول کی اشاعت روک دی، جدید اشاعت میں بھی غلطیاں ہیں لیکن

بہت کم، بعض مقامات پر اور توجہ کی ضرورت تھی، مثلاً ثم استوی الی السماء فسواھن کی تشریح پوری طرح عربی میں ہے، اس کو کتاب کے عام منہج کے اعتبار سے اردو میں بھی ہونا چاہیے تھا، ترجیحات میں بھی مولف مرحوم کے ذوق کا دخل ہے، وجہ ترجیح کی زیادہ وضاحت نہیں ہے، امکانی یا احتمالی توجیہات کا فیصلہ سراسر ان ہی کا ہے، مفسر کے ساتھ معرب کا ترادف بھی مانوس نہیں، پیش لفظ میں مفسرین کو مصنفین سے تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً ترجمہ شیخ الہند کے مصنف، بیان القرآن کے مصنف، ترجمان القرآن کے مصنف، تفسیر ماجدی کے مصنف وغیرہ۔

روایت ودرایت حدیث، ایک تجزیاتی مطالعہ: از ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۲۵۵، قیمت: ۱۵۰/روپے، پتہ: ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی، شعبہ سنی دینیات، اے، ایم، یو علی گڑھ، وریونی ورسل بک ہاؤس، عبدالقادر مارکیٹ (شمشاد مارکیٹ) علی گڑھ۔

علم حدیث میں پہلے بھی اور موجودہ دور میں خاص طور پر یہ بحث کی جاتی رہی ہے کہ روایت ودرایت حدیث کا وہ پیمانہ آخر کیا ہے جو سب کے لیے یکساں قابل قبول ہو، یہ حقیقت ہے کہ محدثین نے سند ومتن میں اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت ودیانت کو کمال احتیاط سے انجام دیا، صحاح وضعاف اور موضوعات کا گراں قدر ذخیرہ ان محدثین کی تلاش ومحنت اور ایمان داری ودیانت داری کا بین ثبوت ہے، فقہا ومجتہدین کی محنت بھی کم نہیں جنہوں نے متن حدیث کی صحت تنقید کے اصول متعین کیے اور تصحیح متن کا انتہائی دشوار کام آسان کیا، اس کے باوجود یہ کہنا کہ تحقیق حدیث کا کام صرف سند ورجال تک محدود ہے علم وفہم کا قصور ہی ہے، اس کتاب میں محدثین کی خدمات اور معترضین کے اعتراضات کا جائزہ اسی مقصد سے ہے کہ غلط فہمیوں اور کج بیانیوں کو درست کیا جاسکے، لائق مصنف نے احساس ذمہ داری سے اپنے تحقیقی مقالے کے لیے درایت حدیث کا تفصیلی جائزہ جیسے اہم عنوان کا انتخاب کیا اور سات ابواب میں حدیث کی روایت و کتابت، وضع حدیث کے اسباب اور ان کا انسداد، علم مصطلح الحدیث، درایت اور اصول درایت جیسے موضوعات پر بہترین بحث کی، ایک باب خارجی نقد وتحقیق اور حدیث کی اندرونی کیفیت خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں غیر احکامی روایات کی نقد وتحقیق کے متعلق اصولی باتیں آگئی

ہیں ، ایک بحث میں ان روایتوں کا بیان ہے جو محدثین کے کل قواعد کی بنیاد پر موضوع قرار دی گئی ہیں ان میں رسول اکرمؐ کی ولادت مبارکہ یا نام احمدؐ و محمدؐ رکھنے کو ذریعہ نجات قرار دینا، یوم عاشوراء اور بعض ایام کے روزوں وغیرہ کے متعلق عوام میں رائج اقوال وغیرہ ہیں، لیکن یہ بحث اور زیادہ مطالعہ کی متقاضی ہے، اس قسم کی روایتوں کے قایلین وعاملین کے دلایل کا تجزیہ بھی ضروری ہے، لایق مصنف کا پیش لفظ اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کا مقدمہ بھی جامعیت کی مثال ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی سلامت فکر اور متوازن نظریہ بحث ہے، عام قاری کو بھی حدیث نبویؐ کے درایتی معیار سے روشناس کرنے میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام، قرآن وحدیث کی روشنی میں: از ڈاکٹر نسیم منصور، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۰۶، قیمت: ۱۰۰/ روپے، پتہ: ڈاکٹر نسیم منصور، صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

معیشت، ملکیت، زراعت، تجارت، بیت المال اور میراث جیسے مسایل اور زکوۃ و متعلقات زکوۃ کے احکام نے اسلام کے اقتصادی ومعاشی نظریات کو تقدیس کے ساتھ ایک مثالی معاشرے کی ناگزیر ضرورت کی حیثیت عطا کی ہے اور یہی دوسرے نظام ہائے معیشت سے اس کے امتیاز کی وجہ بھی ہے، اس مختصر لیکن مفید کتاب میں آسان زبان میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اسلام کے نظام میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی آزادی ہے، جان ومال کے اصل تحفظ اور سرمایہ سے حقیقی منفعت کے دروازوں کو اسلام نے بند نہیں کیا اور ایک فلاحی ریاست کی بنیاد اگر تعلیم، صحت، بے روزگاری کے انسداد، بیواؤں اور یتیموں کی خبرگیری، معذوروں اور مسکینوں کی امداد پر قایم ہے تو اسلام کے نظریہ معاشیات سے بڑھ کر کارگر اور کوئی نظام نہیں، لایق مصنفہ نے اسی اجمال کی تفصیل خوبی سے اس کتاب میں پیش کردی ہے۔

ذوق دہلوی، ایک مطالعہ: مرتب جناب شاہد ماہلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۱۰۸، قیمت: ۷۰/روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۲۔

مضمون آفرینی، خیال بندی، الفاظ کا انتخاب، لفظوں کی ترکیب میں خداداد چستی اور مضامین

کی تازگی ودل چسپی اور صنف سخن پر قدرت نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کو استاذ شہ اور ملک الشعرا کا مقام عطا کیا، ان کے عقیدت مند ان کے کلام کو دیکھ کر کہتے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں، غزل گوئی اور قصیدہ نگاری میں ذوق کے درجے کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ غالب جیسے معاصر پر بوجوہ، عرصے تک غالب رہے، معاصرت کے باوجود غالب کو یہ تاب وطاقت نہیں تھی کہ پرخاش کا خیال بھی آتا، گو زمانے نے بعد میں غالب کی غالبیت پر مہر ثبت کردی اور یہ کہا گیا کہ ادب وشعر کے انقلاب نے ذوق کو بمقابلہ غالب، مغلوب ہی نہیں، نامقبول بھی بنادیا، لیکن خوش ذوقی، کلام ذوق کی داد ومدح کے لیے وقت اور زمانے کی اسیر نہیں، زیر نظر مجموعہ مضامین بھی حسن ذوق کا ایک نمونہ ہے جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمینار کے آٹھ مقالات کو یکجا کیا گیا ہے، استاد ذوق پر اس سمینار کی بلند پایگی کا اندازہ اس کے شرکا اور ان کے مقالات کے عنوانوں سے کیا جاسکتا ہے، ذوق اور اردو ثقافت، قصاید ذوق کی علمی فضا، ذوق کی غزل گوئی، قصاید ذوق کی تفہیم جیسے مقالات کے علاوہ سید ضمیر حسن دہلوی کے مضمون ذوق کی غزل اور دہلی زبان کی روایت اور مطالعات ذوق کا تنقیدی جایزہ جیسے مضامین کی شمولیت نے گویا ذوق کی ملک الشعرائی کا اقرار کرکے ان کو خراج پیش کردیا، ایوان غالب سے یہ ادائے خراج کچھ کم پرلطف نہیں، ڈاکٹر تنویر احمد علوی جن کو ماہر ذوقیات کا درجہ حاصل ہے ان کے اور پروفیسر عبدالحق کے عنوانوں میں بہ ظاہر یکسانی ہے لیکن نتایج فکر کے لحاظ سے بڑا فرق ہے، ڈاکٹر علوی کے نزدیک ذوق کے قصیدے اپنے دور کی علمی فضا اور ثقافتی رنگارنگی کا نشان ہیں اور شہر دہلی اور اس کے شاہی ادارے کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں لیکن پروفیسر عبدالحق کی نگاہ میں یہ سلطنت شاہی سے منسلک ہونے، انعام واکرام کی سرخ روئی، خواص وعوام میں عزت کے حصول کے لیے لکھے گئے، اس تجزیے میں کہیں کہیں تلخی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ آخری مغل تاجدار مدح کے سزاوار تھے کیوں کہ ذوق ان کے نمک پروردہ تھے، غالب کی طرف داری بھی اس طرح جھلکتی ہے کہ "یہ کیا کم ہے کہ غالب نے ذوق کو داد دی اور ایک مکمل شاعر تسلیم کیا"، تاہم پروفیسر عبدالحق کی تلخی حق اس اعتراف سے کم ضرور ہوئی کہ اردو کو ذوق نے بے آبرو ہونے اور احساس کم مائگی سے بچالیا، ایک پتے کی بات سید ضمیر حسن دہلوی نے کہی کہ ذوق کی غزل کو غالب یا مومن کی ضد کے طور پر پڑھنے

کا نتیجہ مایوس کن ہوتا ہے، ان کا کلام خود ان کی شرایط پر پڑھنا چاہیے، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کے مضمون مطالعات ذوق کا تنقیدی جایزہ شاید اس کے لیے مفید ثابت ہو، ذوق کی یاد اور ان کے شاعرانہ مرتبے کی بازیافت کی یہ کوشش غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے ''گزارش احوال واقعی'' کی خوبصورت مثال ہے۔

اشاریہ ماہنامہ الرشاد، اعظم گڈھ: مرتب ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۳۲، قیمت: ۱۵۰/روپے، پتہ: ندوۃ التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڈھ۔

ہماہمی اور وقت کی بے برکتی کے موجودہ دور میں علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کے لیے کتابوں اور رسالوں کے اشاریوں کی اہمیت محتاج بیان نہیں، گو یہ بھی حقیقت ہے کہ اشاریہ نویسی کا شمار مسلمانوں کے علوم وفنون میں ہی ہے، بجا طور پر فہرست ابن الندیم اور کشف الظنون کو بہ طور مثال پیش کیا جاتا ہے، رسایل وجراید کی طویل زندگی کا اندازہ ان کی فایلوں سے ہی ممکن ہے لیکن برسوں پر محیط ان متفرق شماروں کا حصول اور ان کے مشمولات کا علم آسان نہیں، علم وحکمت کے کتنے گہر مجلدات کے صدف میں بند اور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، اشاریے ان کی دریافت کا بہترین ذریعہ ہیں، معارف وبرہان اور دیگر علمی وتحقیقی ومذہبی رسایل کے اشاریوں کی ضرورت اسی لیے محسوس کی گئی، ان میں سے بعض کے اشاریے مرتب بھی ہوئے لیکن ایسے اور رسایل کے اشاریوں کی شدید ضرورت اب بھی باقی ہے، ماہنامہ الرشاد بھی اردو کے موقر ومقتدر رسایل میں ہے، جناب مولانا مجیب اللہ ندوی کی فاضلانہ ادارت نے اس کو علمی ومذہبی حلقوں میں درجہ اعتبار عطا کیا اور قریب ربع صدی سے یہ مسلسل علم ودین کی خدمت میں مصروف ہے، اس کے اشاریے کی ضرورت کو نوجوان اہل قلم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے محسوس کیا وہ خود اس رسالے کی مجلس ادارت میں شامل ہیں، ان کا یہ حق تھا اور زیر نظر اشاریہ کو جس سلیقہ اور محنت سے انہوں نے مرتب کیا، حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، انہوں نے مضامین کی عنوانات، پھر مضمون نگار اور موضوعات کے لحاظ سے الف بائی ترتیب دی، سن اور مہینوں کی وضاحت کی اور اس طرح الرشاد سے استفادے کی سبیل آسان کر دی۔

ع ۔ ص